اِقبالؔ اور عالمِ عربی

و

دیگر مقالات

— از —

ڈاکٹر بدرالدین بٹ

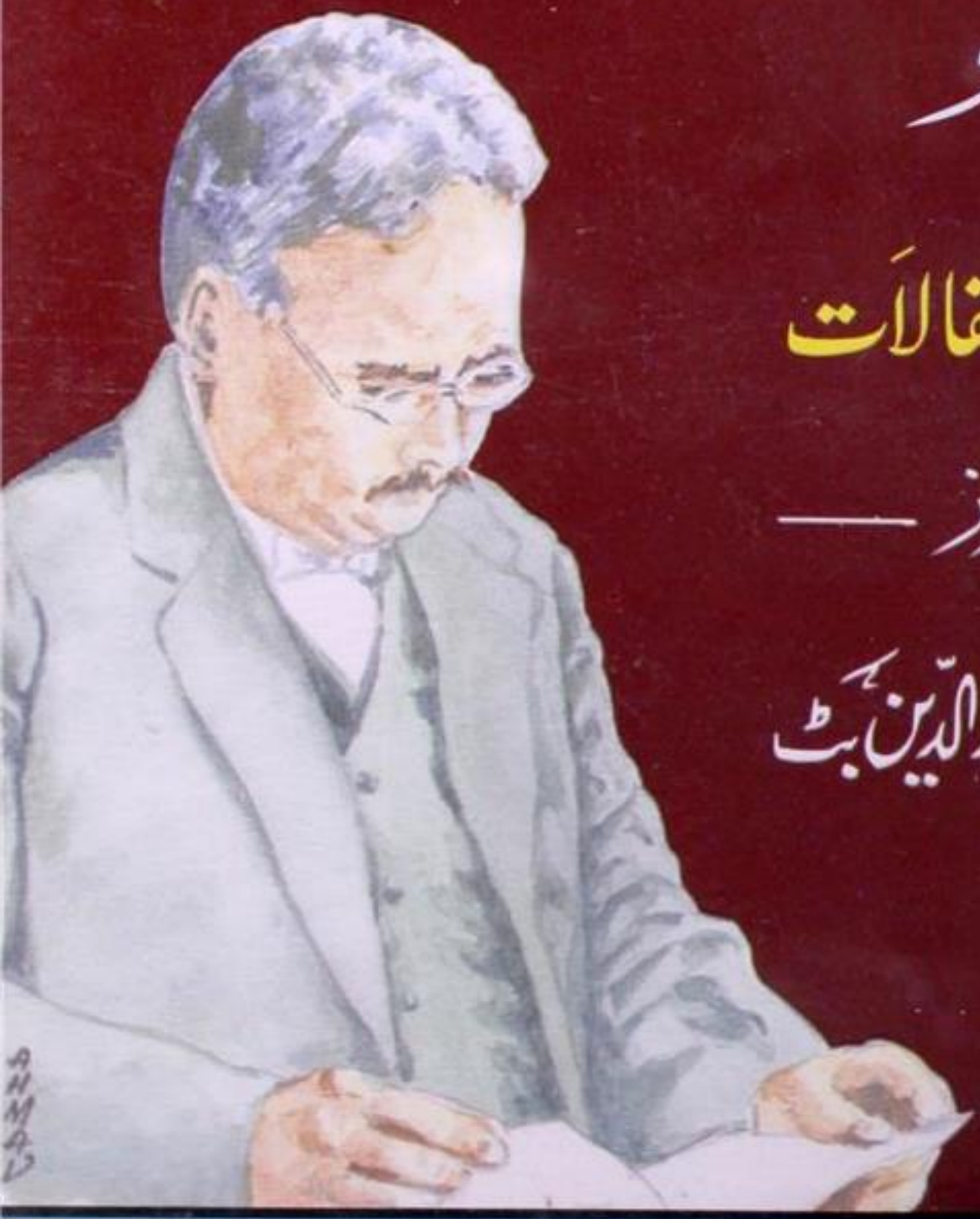

اِقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر

اقبالؔ اور عالم عرب

ڈاکٹر بدرالدین بٹ

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل سرینگر

جملہ حقوق بحق اِقبال انسٹی ٹیوٹ محفوظ ہیں۔

نام کتاب : اقبالؔ اور عالم عرب

مصنف : ڈاکٹر بدرالدین بٹ

سالِ اشاعت : فروری ۲۰۰۷ء

قیمت : ڈیڑھ سو روپے (Rs. 150/-)

کمپوزنگ : وین گارڈ سرینگر۔ ۹۹۰۶۴۹۲۴۲۷

مطبع : مخدومی پرنٹرس، سرینگر۔

ملنے کا پتہ:

اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی سرینگر

فہرست مضامین

۱	پیش لفظ	پروفیسر بشیر احمد نحوی	۵
۲	مُقدّمہ		۷
۳	فکرِ اقبالؔ میں قرآن کا مقام		۱۱
۴	اقبالؔ اور عالم عربی		۲۵
۵	مِصر میں اقبالیات		۴۳
۶	ڈاکٹر احمد امین کے افکار پر اقبالؔ کا اثر		۵۷
۷	کلام اقبالؔ کے عربی تراجم وشروح		۷۳
۸	اقبالؔ پر عربی تصانیف کا ایک تعارف		۸۵
۹	ابوعلی مسکویہ۔۔اقبالؔ کی نظر میں		۱۰۳
۱۰	محمد اقبالؔ۔۔اساطین علم وادب اور زُعماءِ دعوت وفکر کی نگاہ میں		۱۱۷
۱۱	سیرت نبوی ﷺ اور مستشرقینِ کے اعترافات		۱۲۷
۱۲	سَرورِ عالم ﷺ اور عالمی امن		۱۴۹
۱۳	حضرت شاہ ہمدانؒ اور کشمیر		۱۵۷
۱۴	حضرت شاہ ہمدانؒ کے سیاسی افکار		۱۷۹
۱۵	ابتدائی عرب تاریخ نگاری کا ایک مختصر جائزہ		۱۹۵

پروفیسر بشیر احمد نحوی

پیش لفظ

ہمارے اس تحتی براعظم سے باہر فکر اقبالؔ کو دنیا کے دیگر اقوام وملل تک پہنچانے میں عزامؔ، احمد امین، سید میر شکر، علی شریعتی، نکلسن، انما میری شمل، میک ڈوگل اور دیگر درجنوں ادیب، شاعر اور عالم اپنی اپنی بساط کے مطابق تفہیم اقبال اور ترویجِ اقبالؔ میں اپنا بھرپور حصہ ادا کرتے رہے ہیں۔ یہ اقبال کی خوش بختی اور سعادت مندی ہے کہ جو بھی اس کے افکار وتصورات سے آشنا ہو جاتا ہے وہ لازماً اپنے جذبات واحساسات کو گل ہائے عقیدت کی صورت میں کبھی تحریراً اور کبھی زبان وبیان کا سہارا لیکر پیش کرتا ہے۔ ہم نے متعدد خطباً کے خطابات سنے ہیں، لیکن اقبالؔ کے اشعار کے بغیر ان کے خطابات نا تمام اور ان کا شیوۂ گفتار ادھورا ہی ہو کر رہ جاتا ہے۔

سرزمینِ حجازؔ کے ساتھ اقبالؔ کی قلبی وابستگی چھپی ہوئی نہیں ہے وہ جب راونڈ ٹیبل کانفرنس مین بذریعۂ سمندری جہاز سفر کر رہے تھے، تو ایک مقام پر ان کے ہمسفر فضل امام نے ان سے کہا کہ ہم اس وقت ساحلِ مدینہ سے گزر رہے ہیں، تو اقبالؔ زار وقطار رونے لگے۔ حرمین کا ذکر جمیل ہو۔ خاک فلسطین ہو یا نجف، ہو بغداد ہو یا غرناطہ، یہ وہ عرب اماکن ہیں جن کے ذرے ذرے سے

اقبال وابستہ ہیں۔ بدقسمتی سے شعرِ اقبالؔ کی اس عربی آب و ہوا سے اہلِ عرب مدتوں نابلدر ہے، لیکن کچھ عرصہ پہلے، جب کتابی علوم کی ترسیل واشاعت میں سرعت، پھیلاو اور ذرائعِ ابلاغ میں حیران کن تبدیلیاں رونما ہوئیں تو اقبالؔ کا کلام و پیام عربوں تک پہنچنے لگا اوآج دنیا کی کئی زبانوں، خطّوں اور علاقوں میں لوگ اقبالؔ کے فکر ونظر سے متعارف ہورہے ہیں۔ عالم عرب میں جوادبی اور تحقیقی کام ہورہا ہے، اس حوالے سے ہمارے ایک حلیم الطبع اور سلیم الفطرت اسکالرڈاکٹر بدرالدین بٹ گذشتہ سال لال چوک کے ایک اخبارفروش کی دکان کے سامنے ملے۔علیک سلیک کے بعد میں نے ان کے زنبیلِ علمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ کہنے لگے ''یہ چند مضامین اقبالؔ اور اسلام سے متعلق ہیں، جنکی کمپوزنگ کرانی ہے اور پھر کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ ہے''۔ چونکہ میں ان کی خاموش علمی اور تحقیقی کاوشوں سے بخوبی واقف تھا تو میں نے ان مضامین کو انسٹی ٹیوٹ کے توسُّط سے شائع کرنے کی بات چھیڑی اور انہوں نے انتہائی خوشی کے جذبات کے ساتھ مضامین کی نقل میرے سپرد کردی۔ اس موضوع پر کام کرنے کی ابھی کافی گنجائش موجود ہے، اور آئندہ ہمارا ارادہ ہے کہ عربی زبان وادب سے اچھی واقفیت رکھنے والے کسی اسکالر سے اس موضوع پر تحقیقی مقالہ تیار کرائیں گے۔

فی الوقت ڈاکٹر بدرالدین صاحب کی یہ فکر انگیز اور معلوماتی مضامین پر مشتمل کتاب منظرِ عام پر آرہی ہے۔ امید ہے کہ اقبالیاتی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ان مضامین کی تہہ داری، سلاستِ بیان اور معلومات سے مستفید بھی ہونگے اور مستفیض بھی۔

مُقدّمہ

عالمی شعروادب کے منظرنامے پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ جتنی توجہ قبالؔ کی حیات اور شعروفکر پر مرکوز کی گئی اتنی کسی بھی عالمی سطح کے ادیب، دانشور یا شاعر کے نصیب میں نہیں آئی۔ ہزاروں کی تعداد میں کتب و جرائد تحریر کئے گئے جو دنیا کی پچیس سے زائد زبانوں میں چھپ چکے ہیں۔ یہ علمی کام اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اس کا احاطہ کرنے کے لئے بھی کئی کتابیں معرضِ وجود میں آچکی ہیں۔

اقبالؔ کو سرزمینِ حجاز سے عشق تھا اور اسی وجہ سے وہ اس ارضِ عشق و مستی میں موت آنے اور دفن ہونے کی تمنا کا اظہار بھی کر چکے تھے۔ اقبالؔ کو عربوں سے غیر معمولی محبت تھی کیونکہ یہ لوگ سرکارِ دوعالم ﷺ سے نسبت رکھتے ہیں۔ عربی بولتے ہیں یعنی وہ زبان جس میں حضور ﷺ تکلّم فرماتے تھے۔

پروفیسر حُسین مجیب مصری کے خیال میں اقبالؔ عربوں کے ایک دردمند مورّخ تھے جنہوں نے عربوں کے ماضی و حال کے مسائل پر دِلسوزی اور پوری گہرائی کے ساتھ جائزہ لے کر ان کا حل اپنی شاعری کے وسیلہ سے دنیا کے سامنے

پیش کیا۔

عربوں نے بھی اقبالؔ کے جذبۂ عشق و محبت اور خیر خواہی کا احساس کر کے اقبالؔ کے تقریباً تمام شعری مجموعوں اور ان کی فلسفیانہ تصنیف ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کا عربی میں ترجمہ کیا۔ یہ وہ امتیاز ہے جس میں کوئی شاعر یا مفکر یا دانشور اقبالؔ کا ہمسر نہیں۔

اقبالؔ کو عالم عربی میں متعارف کرانے میں مصر کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ یہاں کے علماء، دانشور، شعرا اور اصحاب فکر نے اقبالؔ کے فکر و نظر کو عام کرانے میں ناقابل فراموش کارنامے انجام دئے ہیں۔

پرفیسر عبدالوہاب عزّام اس قافلہ عشق و مستی کے سرخیل ہیں جنہوں نے اقبال کو عالم عربی میں متعارف کرانے کا بیڑا اُٹھایا۔ اس کے بعد ہی مصری مفکرین اور دانشوروں کی ایک ٹیم اس کارِ خیر میں پوری تندہی کے ساتھ جُٹ گئی اور اقبالؔ کے شعر و فکر پر گرانقدر تصنیفات سے عربی زبان کا دامن بھر دیا۔ عزام کے بعد جن شعرا اور ادبا نے اقبالؔ کے فکر و فن کو عام کرنے میں اہم رول ادا کیا ان میں شیخ صاوی شعلان، پروفیسر حسین مجیب مصری۔ ڈاکٹر نجیب کیلانی اور عباس محمود کے نام قابل ذکر ہیں۔ ستارہ مشرق اُمّ کلثوم کا ذکر اس موقع پر اس لئے بے محل نہیں کہ مرحومہ نے اقبالؔ کی ''شکوہ'' اور جواب شکوہ'' کے عربی ترجمہ کو اپنی سحر طراز آواز میں عربوں کے گھر گھر میں پہنچا دیا۔

زیرِنظر مقالات کو اسی غرض کے لئے تحریر کیا گیا ہے کہ عرب ممالک میں اقبالؔ پر ہو رہے کام کا ایک تفصیلی تعارف (جو اگر چہ تفصیلی نہیں ہے) شائقین اقبالؔ کے سامنے پیش کیا جائے۔ کیونکہ اس موضوع پر کوئی خاطر خواہ علمی کام ابھی یہاں نہیں ہوا ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ان مقالات کے اولین محرّک اقبالؔ انسٹی ٹیوٹ کے مرحوم و مغفور ڈائریکٹر پروفیسر محمد امین اندرابی صاحب تھے جنہوں نے اس موضوع پر کام کرنے کے لئے مجھے آمادہ کیا۔

پروفیسر اندرابی صاحب کے بعد اقبالؔ انسٹی ٹیوٹ کی زمام کار جواں سال و جواں فکر اہل علم پروفیسر بشیر احمد نحوؔی صاحب نے سنبھالی۔ پروفیسر نحوؔی صاحب نے انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیوں کو کثیر جہت بنا دیا۔ اقبالؔ پر علمی کام کرانے کے علاوہ انہوں نے ان تمام علمی شعبوں پر بھی کام کرنے کا آغاز کر دیا جن سے اقبالیات کا بِلواسطہ یا بلاواسطہ تعلق ہے۔ چنانچہ اقبالیات کے علاوہ قرآنیات، سیرت سَرورِ کائنات ﷺ، اسلامی تاریخ، اسلامی ادب و ثقافت اور مشاہیر اسلام پر بھی علمی مجلسوں کا انعقاد کیا گیا جن میں وادی کے نہ صرف سرکردہ دانشور حضرات شریک ہوتے ہیں بلکہ نوجوان محققین کی بھی بھرپور حوصلہ افزائی کی جاتی ہے جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ ان مُحقِقین کی فکری کاوشیں ملک اور بیرون مُلک کے سرکردہ جرائد میں جگہ پاتی ہیں۔ چنانچہ راقم الحروف کے اقبالؔ پر لکھے گئے مقالات کے علاوہ دیگر مقالات کی شان نزول بھی یہی ہے۔

میں پروفیسر نحوی صاحب کا مُتشکر ہوں کہ انہوں نے میرے ان مقالات کو کتابی شکل میں شائع کرانے کا فیصلہ کر دیا۔ یہ اُن کی ذرّہ نوازی اور علم پروری کا بیّن ثبوت ہے۔ اپنے اُستادِ مکرّم پروفیسر مُختار الدین احمد صاحب (علیگڈھ) کا بھی ممنون ہوں، جنکی ذاتی دلچسپی سے بعض عربی کتابیں فراہم ہوسکیں۔

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی صاحب (پاکستان) کا بھی ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن کی تحریروں سے نشانِ راہ پاکر میں نے یہ مقالات قلمبند کئے ہیں۔

خدا کرے کہ یہ مجموعہ مقالات اقبالؔ کے نورِ بصیرت کو عام کرنے میں مُمد ومعاون ثابت ہو۔

۲۱ جنوری ۲۰۰۷ء

ڈاکٹر بدرالدین بٹ

سابق صدر شعبہ عربی واسلامیات

اسلامیہ کالج، سرینگر، کشمیر

فکرِ اقبالؔ میں قرآن کا مقام

علامہ محمد اقبالؔ (۱۸۷۳ء۔۱۹۳۸ء) کا قرآن سے جو شغف اور انہماک رہا ہے وہ ان کی رودادِ حیات، اُن کی شاعری، ان کے مکاتیب اور اُن کے خطبات کے مطالعہ سے بآسانی دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے، ان کی تعمیرِ شخصیت میں عشقِ رسولؐ کے علاوہ قرآن مجید سب سے زیادہ حاوی اور نمایاں ہے۔ ان ہی دو چیزوں کو اقبالؔ شخصی عناصر Personal Elements سے تعبیر کرتے ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اقبالؔ کی زندگی پر یہ عظیم کتاب جس قدر اثر انداز ہوئی اتنا نہ وہ کسی شخصیت سے متاثر ہوئے اور نہ کسی کتاب نے ان پر ایسا اثر ڈالا ہے۔[1]

اقبالؔ کے عشقِ قرآن کا اندازہ ان کے تلاوتِ قرآن کے معمول سے لگایا جا سکتا ہے جس پر وہ تا حیات قائم و دائم رہے۔ وہ نہایت ہی ذوق و شوق، جذب و وارفتگی اور والہانہ انداز میں اسکی تلاوت فرماتے۔ محمد اقبال سلمانی نے اس سلسلہ میں ایک نہایت مؤثر واقعہ بیان کیا ہے۔ اُنہوں نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کی کتابیں اسلامیہ

کالج لاہور کی لائبریری کو دی گئیں۔ ان ہی کتابوں میں ڈاکٹر صاحب کی تلاوت کا خاص قرآن ازروئے وصیت ان کے لختِ جگر جاوید کو ملا۔ اور اس مصحف کے متعلق ڈاکٹر صاحب کے خاص احباب کا بیان ہے کہ وہ بلا ناغہ صبح کے وقت اس کی تلاوت ایسے ذوق وشوق، ایسے درد ومحبت اور سوز وگداز کے ساتھ کیا کرتے کہ آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا، روتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ کتاب عزیز کے ورق بھیگ جاتے۔ جب تلاوت ختم ہو جاتی تو اُسے اُٹھا کر دھوپ میں رکھ دیتے تاکہ صفحے خشک ہو جائیں۔ مدتُ العمر تک ان کا یہی دستور رہا۔ حتیٰ کہ زندگی کے آخری دنوں میں جب بیماری کا تسلّط بڑھ گیا اور گلا خراب ہو جانے کی وجہ سے آواز میں متی لگ گئی تو ڈاکٹروں کے روکنے پر آپ کا یہ طریقِ تلاوت بھی چھوٹ گیا جس کا ان کو نہایت رنج تھا۔

اقبالؔ کے والد ماجد نے انہیں یہ نصیحت کی تھی کہ قرآن کی تلاوت اس طرح کرو جیسے تم پر ہی نازل ہوا ہے۔

تیرے ضمیر پر جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کُشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشّاف

مگر ضمیر پر قرآن کا نزول کس طرح ہو اور وہ ضمیر جس پر قرآن نازل ہو

کیسے تیار ہوا اس سلسلہ میں اقبالؔ خود ہی فرماتے ہیں:

''یہ حقیقت اس طرح سمجھ آئے گی کہ کالج میں میری تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا میرا معمول تھا کہ ہر روز فجر کے بعد قرآن کی تلاوت کرتا۔ اس دوران والد ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آتے اور مجھے تلاوت کرتا دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ میں کبھی ایک منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی کم۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ والد ماجد حسبِ معمول مسجد سے واپس آئے میں تلاوت میں مصروف تھا مگر جیسے وہ کسی خیال میں میرے پاس بیٹھ گئے میں تلاوت کرتے کرتے رُک گیا اور منتظر تھا کہ مجھ سے کیا ارشاد فرماتے ہیں کہنے لگے ''تم کیا پڑھتے ہو؟'' مجھے ان کے سوال پر نہایت تعجب ہوا۔ بلکہ ملال بھی۔ اُنہیں معلوم تھا کہ میں قرآن پاک تلاوت کر رہا ہوں۔ بہر حال میں نے مؤدبانہ عرض کیا ''قرآن پاک''۔ کہنے لگے تم جو کچھ پڑھتے ہو سمجھتے بھی ہو؟ میں نے کہا۔ کیوں نہیں۔ تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ اُنہوں نے میرا جواب خاموشی سے سُنا اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں حیران تھا کہ آخر اس سوال سے ان کا مقصد کیا تھا۔ کچھ دن گذر گئے اور یہ بات جیسے آئی گئی ہوگئی لیکن اس واقعہ کا چھٹا روز تھا کہ صبح سویرے میں حسب معمول قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا والد ماجد مسجد سے آئے اور میں نے تلاوت ختم کی تو اُنہوں نے مجھے بُلایا اور اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے ''بیٹا قرآن مجید وہی سمجھ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو۔ مجھے

تعجب ہوا۔ حضور رسالت مآب ﷺ کے بعد قرآن پاک کس پر نازل ہوا ہے کہ اب ہوگا؟ فرمانے لگے ”کیوں نہ تم اسکی تلاوت اس طرح کرو جیسے یہ تم پر نازل ہو رہا ہے ایسا کرو گے تو یہ تمہارے رَگ و پے میں سرایت کر جائے گا“۔ میں ہمہ تن گوش والد صاحب کی بات سنتا رہا بلکہ اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا کہ قرآن مجید کی تلاوت ویسے ہی کروں جیسے ان کا ارشاد ہے اُنہوں نے کہا سنو! اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارادہ عالم انسانیت کو جس معراج پر پہنچانے کا تھا اس کا آخری کامل اور مکمل نمونہ ہمارے نبی اکرم محمد مصطفٰے احمد مجتبیٰ ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات میں ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ لہٰذا ہم کہیں گے کہ آدمؑ سے حضورؐ تک کہ خاتم الانبیاء ہیں جتنے بھی نبی مبعوث ہوئے ان میں ہر ایک کا گذر مدارج محمدیہ ﷺ ہی میں ہو رہا تھا وہ گویا ایک سلسلہ تھا جس کا خاتمہ ذاتِ محمدیہ ﷺ کی تشکیل پر ہوا۔ والد ماجد نے پھر خود ہی اپنے اس ارشاد کی تشریح کی۔ اُنہوں نے کہا۔ شعورِ انسانی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ بالآخر جب وہ مرحلہ بھی آ گیا کہ زندگی اپنے مقصود کو پالے تو ذاتِ محمدیہ ﷺ بھی اپنی پُوری شان سے جلوہ گر ہوگئی۔ حضور رسالت مآب ﷺ تشریف لے آئے۔ بابِ نبوت بند ہوا۔ انسانیت اپنی معراج کمال کو پہنچی اور حضور ﷺ کا اسوہ حسنہ و کاملہ بھی ہر اعتبار سے ہمارے لئے حجت مثال اور نمونہ ٹھہرا۔ اب جتنا بھی کوئی اس رنگ میں رنگتا چلا جائے اتنا ہی قرآن مجید اس پر نازل ہوتا رہے گا۔ یہ مطلب تھا میرا اس

کہنے کا کہ قرآن مجید اسی کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو'' [۳]

پروفیسر محمد منوّر کے الفاظ میں یہ سوال ہمیشہ سے اہل علم و دانش کے یہاں زیر بحث رہا ہے کہ وحی الٰہی جو آسمانی کتب میں مرقوم ہے آیا از روئے مفہوم ومعنی وحی ہے یا لفظاً بھی وحی ہے آیا صرف مضمون ہی رسولوں کے دل میں ڈالا جاتا ہے یا مضمون کے ساتھ الفاظ بھی ادھر ہی سے آتے تھے خود قرآن کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل ہوا۔ حضرت جبرئیل امینؑ کی وساطت سے نازل ہوا، حضور اکرم ﷺ کے قلب پر نازل ہوا اور بڑی فصیح اور واضح عربی میں نازل ہوا تا کہ لوگوں کو بخوبی متنبہ اور آگاہ کیا جا سکے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں۔

وانہ لتنزیل من رب العالمین، نزل به الروح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین [۴]

اقبالؔ کو یقین کامل تھا کہ قرآن مجید لفظاً نازل ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک دفعہ فارمن کرسچین کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس کے ساتھ گفتگو ہوئی۔ ڈاکٹر لوکس نے اقبالؔ سے کہا، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارے نزدیک پیغمبر ﷺ پر قرآن کریم کا صرف مفہوم نازل ہوا تھا اور اسے اپنی زبان میں منتقل کرلیا یا قرآن کی موجودہ عبارت بھی نازل ہوئی تھی۔ گویا تمہارے عقیدے میں قرآن کے مطالب الہامی ہیں یا تم اس کے الفاظ کو بھی الہامی سمجھتے ہو؟ اقبالؔ نے اس کا

جو برجستہ جواب دیا اس سے ان کی قرآن اور رسول ﷺ کے ساتھ راسخ الاعتقادی اور اس بے پناہ عشق و محبت کا اندازہ ہوتا ہے جو ان کے دل میں موجزن تھا۔ فرمایا ''ڈاکٹر صاحب! میں تو قرآن کریم کے الفاظ کو بھی الہامی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک قرآن کی عبارت عربی زبان میں آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی'' ڈاکٹر لوکس یہ غیر متوقع جواب سُن کر حیران ہو گئے اور بڑے تعجب آمیز لہجے میں بولے ''مجھے حیرت ہے کہ تم ایسا ہوشمند کسی ثبوت کے بغیر اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ قرآن کے الفاظ بھی الہامی ہیں''

میں نے کہا ''ڈاکٹر صاحب! جب مجھ پر شعر کہنے کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو مجھ پر شعر پُورا اُترتا ہے۔ پھر نبی آخر الزمان ﷺ پر جسے خدا نے دُنیا کی رشد و ہدایت کیلئے بھیجا تھا قرآن کریم کی پُوری عبارت کیوں نازل نہیں ہو سکتی اس میں تعجب کی کون سی بات ہے''[۵]

اقبالؔ کے نزدیک قرآن مجید ہی وہ معیار حق ہے جس پر وہ ہر چیز کو پرکھنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ کسی رو رعایت کے قائل نہ تھے۔ تصوف کو جس سے ان کا خمیر ہی اُٹھا تھا بھی وہ اسی خراد پر چڑھانے کے قائل تھے۔ خواجہ حسن نظامی سے اس سلسلہ میں جو مراسلت کیمبرج سے اقبالؔ نے کی ہے اس میں حسن نظامی سے تصوف کے جواز میں قرآنی دلائل مانگتے ہیں[۶] وہ محض قرآن کی خاطر اپنے بعض خیالات کو ترک کرتے ہیں۔ حسن نظامی کے نام ایک خط میں لکھتے

ہیں:

''قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مجھے اپنی غلطی معلوم ہوئی اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا اور اس مقصد کیلئے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا'' ۷

اقبالؔ قرآن کی ایسی تفسیر کرنے کے بھی مخالف تھے جس سے قرآن کی اصل روح سے انحراف ہوتا ہو یا جو محاورہ عرب کے خلاف ہو۔ چنانچہ سراج الدین پال کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی کا علم اُٹھ گیا ہے اور قرآن کی تفسیر میں محاورہ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معنی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان میں ہرگز نہیں ہیں۔ کل میں ایک صوفی مُفسرِ قرآن کی ایک کتاب دیکھ رہا تھا لکھتے ہیں ''خلق الارض والسمٰوات فی ستة ایام ''میں ایام سے مراد تنزلات ہیں یعنی ''فی ستة تنزلات ''ہیں۔ کمبخت کو یہ معلوم نہیں کہ عربی زبان میں یوم کا یہ مفہوم قطعاً نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے کہ تخلیق بالتنزلات کا مفہوم ہی عربوں کے مذاق اور فطرت کے خلاف ہے اس طرح ان لوگوں نے نہایت بیدردی سے قرآن اور اسلام میں ہندی اور یونانی تخیلات داخل کر دئے'' ۸

قرآن مجید ہی اقبالؔ کی وہ محبوب کتاب تھی جس سے اُنہیں نئے نئے علوم کا انکشاف ہوتا۔اس سے انہیں ایک نیا یقین، ایک نئی روشنی اور ایک نئی قوت وتوانائی حاصل ہوتی۔ جوں جوں ان کا مطالعہ قرآن بڑھتا گیا ان کے فکر میں بُلندی اور ایمان میں زیادتی ہوتی گئی۹

اقبالؔ کے نزدیک قرآن انسانی مسائل اور اقتصادی امراض کا بہترین علاج پیش کرتا ہے۔اڈیٹر زمیندار کے نام ۲۴ جون ۲۳ء کے ایک خط میں اس محکم یقین کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''میں مسلمان ہوں میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کیلئے ایک قسم کی لعنت ہے لیکن دُنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں۔قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لئے قانون میراث، حرمت ربا اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے۔اور فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابل عمل بھی ہے۔مسلمان جو یورپ کی پولٹیکل اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں ان کے لئے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظر غائر ڈالیں

مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مُشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔[۱۰]

مکاتیب اقبالؔ کے مُطالعہِ سے پتہ چلتا ہے کہ اقبالؔ آخری سالوں میں قرآن کریم پر ایک کتاب قلمبند کرنا چاہتے تھے۔ سرراس مسعود کو اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۳۵ء میں لکھتے ہیں کہ ''قرآن کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کرتا جو عرصے سے میرے زیرِغور ہیں لیکن اب نہ معلوم کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اگر مجھے حیاتِ مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسّر آئے تو میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہترین کوئی پیش کش مُسلمانانِ عالم کو نہیں کرسکتا''۔[۱۱]

مولانا عبدالسّلام ندوی نے اس کتاب کے بارے میں رائے ظاہر کی ہے کہ اجتماعی تحریکات کو دیکھ کر اقبالؔ کے دل میں یہ خیال روز بہ روز مستحکم ہوتا گیا کہ اس وقت اسلام کے نظام عمرانی کی تشریح وتوضیح کی ضرورت ہے اس لئے وہ چاہتے تھے کہ ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامی'' کی طرح تشکیل جدید فقہ اسلامی پر یہ دیکھ کر کہ قرآن پاک نے ان مسائل کی راہنمائی کس انداز میں کی ہے قلم اُٹھائیں۔[۱۲] اقبال کے ایک مکتوب سے اس رائے کی تصدیق ہوتی ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں۔

''ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور

خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادت انسانی کیلئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں۔ اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو قواعد، عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موخرالذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں رائج ہیں ان پر عمل کرنے سے نوع انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہوسکتی۔

''میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نظر سے زمانہ حال کے Jurisprudence یعنی اصول فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنی کی ابدیت کو ثابت کریگا وہی اسلام کا مجدد ہوگا۔ اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا''۔[۱۳]

ان ہی ایام میں پٹھان کوٹ ضلع گرداسپور کے ایک مخیّر مسلمان انجینئر چودھری نیاز علی خان نے خدمت اسلام کیلئے ایک وقف قائم کیا وہ اقبالؔ سے اسکی سرپرستی، اس کے مقاصد کا تعین اور اس کے بہترین مصرف کا طریقہ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اقبالؔ کے دل میں اپنے تدوین فقہ جدید کے منصوبے کے لئے سروسامان پیدا ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ چنانچہ اُنہوں نے چودھری صاحب کو متعدد مشورے دے۔ اصل مسئلہ اس ادارے کیلئے ایک ایسی شخصیت کی فراہمی تھی۔ جو تعلیم و تربیت اور تصنیف و تالیف کی پوری اسکیم کی نگرانی کرے اور ایک طرف علم و

فضل کی قوت سے دور حاضر کے مسائل کا جواب دے اور دوسری طرف ایسے افراد تیار کرے جو عالم اسلام میں فکری اور عملی انقلاب لانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔[۱۴] سید نذیر نیازی نے اپنی کتاب ''مجلس اقبال'' میں چودھری نیاز علی صاحب کی اقبال کے ساتھ اس سلسلہ کی ایک مُلاقات کے بارے میں لکھا ہے۔

''چودھری نیاز علی خان، جاوید منزل میورو ڈ لاہور تشریف لائے اور ان کے ہمراہ علامہ محمد اسد بھی تھے ان کی خواہش تھی کہ دارالاسلام وقف کے کام میں علامہ راہنمائی فرمائیں اور جیسا ان کا مشورہ ہو اس کے مطابق بعض علمائے دین کو دارالاسلام آنے کی دعوت دی جائے حضرت علامہ نے کہا کہ سردست ایک نام میرے ذہن میں آتا ہے۔ حیدرآباد دکن سے ''ترجمان القرآن'' کے نام سے ایک بڑا اچھا رسالہ نکل رہا ہے۔ موڈودی صاحب اس کے اڈیٹر ہیں ان کے مضامین میں نے پڑھے ہیں۔ دین کے ساتھ ساتھ وہ مسائل حاضرہ پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' مجھے بہت پسند آئی ہے۔ آپ کیوں نہ انہیں دارالاسلام آنے کی دعوت دیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ دعوت قبول کرلیں گے۔[۱۵]

۱۹۳۷ء میں چودھری صاحب اور مولانا مودودی اقبال سے لاہور میں ملے۔ مولانا مودودی نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ اقبال نے مجھے رائے دی کہ میں چودھری صاحب کی دعوت قبول کرلوں اور مجھ سے وعدہ کیا کہ اگر میں وہاں

منتقلِ ہو جاؤں تو وہ خود سال میں چھ مہینے وہاں قیام فرمایا کریں گے۔ میرے لئے ان کی یہ پیش کش اسقدر جاذب نظر تھی کہ میں نے بلا تامل اسکو قبول کرلیا اور مارچ ۳۸ء میں حیدر آباد سے دارالاسلام منتقل ہوگیا۔ لیکن افسوس کہ دوسرے ہی مہینے، اپریل میں علامہ مرحوم کا انتقال ہوگیا اور تنہا مجھے ہی وہ کام کرنا پڑا جسے علامہ اقبالؔ، چودھری صاحب مرحوم میرے ساتھ مل کر کرنا چاہتے تھے۔ ۱۶

ان ساری تفصیلات سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ قلب اقبالؔ میں قرآن پاک کی قدر و منزلت کیا تھی اور کس طرح وہ قرآن ہی کے حوالے سے انسان کے تمام روحانی، سیاسی سماجی اور اقتصادی مسائل کا حل ڈھونڈ نکالنے کے متلاشی اور مُتمنی تھے، اقبالؔ کی اسی فنائیت فی القرآن کے بارے میں سید ابوالاعلیٰ مودُودی رقمطراز ہیں۔

''مغربی تہذیب و تعلیم کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مُسلمان تھا۔ اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ جتنا اسکی گہرائیوں میں اُترتا گیا۔ اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا یہاں تک کہ اس کی تہہ میں جب وہ پہنچا تو دُنیا نے دیکھ لیا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اسکا کوئی فکری وجود باقی نہ رہا وہ جو کچھ سوچتا تھا قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا جو کچھ دیکھتا تھا قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا، حقیقت اور قرآن اس کی نظر میں شے واحد تھے اور اس شے واحد میں وہ اس طرح فنا ہوگیا کہ اس دور کے علماء دین میں مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو فنائیت فی القرآن میں اس امام فلسفہ سے لگا کھاتا ہو'' ۱۷

حوالے

۱) نقوش اقبالؔ، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو، ۱۹۷۲ء۔ ص ۶۱۔

۲) البیان دسمبر ۱۹۳۹ء ص ص ۷۵۔۷۶، بحوالہ اقبالؔ کامل اور مولانا عبدالسلام ندوی اعظم گڈھ ۱۹۷۹ء ص ص ۷۶۔۷۷

۳) اقبالؔ کے حضور از سید نذیر نیازی ص ص۔ ۶۰۔۶۱ بحوالہ مقالہ علامہ اقبالؔ بحضور قرآن از پروفیسر محمد منور در رسالہ صحیفہ نومبر۔ دسمبر ۷۷ء اقبالؔ نمبر ص ص ۷۲۔۷۳،

۴) حوالہ مذکور ص ۶۳۔

۵) روزِ گار فقیر جلد اول از سید وحید الدین، اسلامک بک فاونڈیشن، نئی دہلی ۱۹۹۲ء، ص ۳۹

۶) کلیات مکاتیب اقبالؔ جلد اول مرتبہ سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی دہلی ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۸

۷) ایضاً۔ ص ۴۴۸۔۴۴۹

۸) ایضاً۔ ص ۵۲۱

۹) نقوش اقبالؔ ص ۶۲

۱۰) بحوالہ مقالہ فکر اقبالؔ کا ماخذ از جمیل یوسف در مجلّہ صحیفہ نومبر۔ دسمبر ۷۷ء اقبالؔ نمبر ص ۱۶۹۔۱۷۰

(۱۱ اقبال نامہ ص ۳۵۷۔۳۵۸۔ بحوالہ اقبال کامل ص ۱۰۷

(۱۲ اقبال کامل ۔ص ۱۰۸

(۱۳ اقبال نامہ جلد اول ص ص ۴۹۔۵۰ بحوالہ اقبال، دارالاسلام اور مودودی از اسعد گیلانی، اسلامی اکادمی لاہور پاکستان ۱۹۷۸ء ص ص ۷۶۔۷۷

(۱۴ اقبال، دارالاسلام اور مودودی ص ۸۱

(۱۵ بحوالہ اقبال، دارالاسلام اور مودودی ص ۸۱

(۱۶ ایضاً۔ص ص ۲۸۰۔۲۸۱

(۱۷ پندرہ روزہ الحسنات رام پور جولائی ۱۹۶۴ء ص ص ۲۴۔۲۵ بحوالہ نوائے مشرق علامہ اقبال اور مولانا مودودی کا ایک تقابلی مطالعہ از سعید احمد۔تاج کمپنی دہلی ۱۹۹۲ء ص ۱

اقبالؔ اور عالمِ عربی

ڈاکٹر اقبالؔ کی برابر یہ خواہش رہی کہ کاش وہ عربی میں شعر کہہ سکتے لیکن اُن کا یہ ارمان پورا تو نہیں ہو سکا۔[۱] مگر اُن کے فارسی اور اُردو کلام کو منظوم اور منشور ترجموں کے ذریعہ عربوں تک پہنچایا گیا جس سے ایک حد تک تلافی مافات ہوئی۔

اقبالؔ کو عرب دنیا میں متعارف کرانے کا سلسلہ ۱۹۴۶ء سے ہی شروع ہوا جب مرکزی بزم اقبالؔ حیدرآباد دکن نے الحیاۃ والموت فی فلسفۃ اقبال کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس کی اشاعتِ دوم کراچی سے ۱۹۴۹ء میں ہوئی[۲]۔ اس کے بعد اقبالؔ کے کلام کے ترجموں اور ان پر مستقل تصانیف کا آغاز ہوا جو ابھی تک جاری ہے اور آثار و قرائن بتا رہے ہیں کہ اقبالؔ شناسی کی کاوشیں آئندہ بھی جاری رہیں گی۔ دنیائے عرب میں اقبالؔ کی شاعری اور افکار کو عام کرنے میں سب سے پہلے مرحوم ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے مربوط طور پر کام کیا۔ انہوں نے نہ صرف کلام اقبالؔ کا منظوم ترجمہ کیا بلکہ اقبالؔ کی حیات شعر و فلسفہ اور ادب پر بھی کتابیں اور مقالات لکھے جو عرب قارئین میں بہت مقبول

ہوئے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ڈاکٹر عزام کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ڈاکٹر عزام کی خدمت اسلام وادب کی ایک بڑی خدمت ہے جو ہر قدر دانی اور شکر و اعتراف کی مستحق ہے۔ یہ اقبالؔ کی خوش نصبی تھی کہ انہیں عزام سا ترجمان مِلا۔ اقبالؔ کی روح اُن کی اس محنت و محبّت پر یقیناً بہت مسرور ہوئی ہوگی۔[۳]

عبدالوہاب عزام کے بعد جس مصری ادیب نے اقبالؔ پر مفید کام کیا ہے وہ پروفیسر ڈاکٹر حسین مُجیب مصری ہیں جو تیس سے زائد کتابوں کے مصنّف ہیں جن میں عربی اور فارسی کے کئی شعری مجموعوں کے علاوہ ادبی، مذہبی اور تاریخی کتب بھی شامل ہیں۔ وہ عربی، فارسی، ترکی، فرانسیسی اور انگریزی کے ایک اچھے عالم و فاضِل اور مترجم ہونے کے علاوہ اُردو سے بھی کما حقہ واقف ہیں۔ عربی، فارسی اور ترکی ادب کے تقابلی مُطالعہ کے علاوہ امتِ مُسلمہ کی قدیم و جدید اہم شخصیات اور مصلحین پر فاضلانہ مقالے سُپردِ قلم کر چکے ہیں۔

کلام اقبالؔ سے پروفیسر حسین کو والہانہ شغف ہے۔ انہوں نے کلام اقبالؔ کا منظوم ترجمہ موجود ہونے کے باوجود نئے سرے سے جاوید نامہ کا منظوم ترجمہ فی السماء، ارمغان حجاز کا هدية الحجاز اور گلشن راز جدید کا روضة الاسرار کے نام سے کیا ہے۔ یہ سارے منظوم تراجم قاہرہ سے چھپ کر دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان تراجم کے علاوہ اقبالؔ پر پروفیسر

حسین مُجیب نے تین کتابیں اقبال و العالمُ العربی، اقبال و القرآن اور اقبال بین المصلحین الاسلامین بھی لکھی ہیں۔ زیرِ نظر مقالے میں اقبالؔ پر پروفیسر حسین مجیب کے ان خیالات پر گفتگو کی جائے گی جو انہوں نے اپنی کتاب اقبال و العالمُ العربی میں پیش کئے ہیں۔

عربوں میں اقبالؔ کی مقبولیت کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اقبالؔ کے اشعار وافکار کی اہم ترین اساس اسلام ہے۔ عربوں سے اسلام کا براہ راست تعلق ہے اور اسی حوالے سے اقبال نے اُن کے دین و مذہب تہذیب وتمدن، شعروادب، فلسفہ وکلام، تاریخ اور ثقافت سے بڑا اثر قبول کیا ہے اور تمام چیزوں کو اپنی نظم ونثر میں جابجا جگہ دی ہے۔ عرب جب کلام اقبالؔ پڑھتے ہیں تو انہیں نہ صرف اپنا ماضی یاد آتا ہے بلکہ وہ اپنی تاریخ کے ان نخلستانوں میں کھو جاتے ہیں جن میں انھوں نے انسانیت علم وفن، تہذیب وتمدن، سائنس اور علوم طبیعہ کو چار چاند لگائے تھے۔

اقبالؔ کو سرزمین حجاز سے عشق تھا اور اُن کے خیال میں وہاں کی مٹی کا ذرہ ذرہ عشق سے معمور ہے۔ اس عشق کی بدولت انہوں نے رموز بے خودی میں حجاز ہی میں موت آئے اور دفن ہونے کی تمنا کا اظہار کیا ہے[۴]۔ پروفیسر یوسف سلیم چستی نے شرح ضرب کلیم میں لکھا ہے کہ اقبالؔ نے مجھے بتایا کہ ''مجھے عربوں سے غیر معمولی محبت ہے کیونکہ یہ لوگ سرکار دوعالم ﷺ سے نسبت رکھتے ہیں، عربی

بولتے ہیں، وہ زبان جس میں حضورؐ تکلم فرماتے تھے۵۔

پروفیسر حسین مجیب نے سب سے پہلے جاوید جامہ پر گفتگو کی ہے اور طاسین محمد ﷺ کے تحت محمد عربی ﷺ کے دشمنِ جان ابوجہل کی روح کے کعبہ میں ماتم کناں ہونے کے بارے میں لکھا ہے۔ ابوجہل دین محمدی ﷺ کو عرب مظاہر پرستی، قریشی عصبیت وقومیت کے بتوں کو پاش پاش کرنے والا دین بتلاتے ہوئے نوحہ کرتا ہے۔

سینۂ ماز محمد داغ داغ
از دم او کعبہ را گُل شد چراغ
ساحرو اندر کلامش ساحری است
این دوحرف لااِلٰہ خود کافری است
پاش پاش از ضربتش لات ومنات
انتقام از وے بگیرائے کائنات
دل بغائب بست واز حاضر گُسست
نقش حاضر رافسوں اوشکست
آنچہ اندر دیدہ می ناید کجاست
دیدہ برغائب فروبستن خطاست

پیش غائب سجدہ بردن کوری است
دین نوکو راست وکوری دوراست
خم شُدن پیش خدائے بے جہات
بندہ راذو قے نہ بخشد ایں صلوات ؎

اسلام سے قبل عرب بُت پرسی، قومی عصبیت، تنگ نظری، ظلم و جبر اور طبقاتی کشمکش کی لعنتوں میں گرفتار تھے۔ اسلام نے ان کو یکسر ختم کر دیا اور انہیں غور و فکر کرنے کی دعوت دی۔ اس کے نتیجے میں اُن کے دلوں سے شکوک و شبہات کے بادل چھٹ گئے۔ ان کی روح و عقل میں وہ پاکیزگی، پختگی اور صلابت آ گئی کہ اونٹوں کے گلہ بان اقوام عالم کے نگہبان ہو گئے۔ اور انہوں نے دنیا کی عظیم ترین تہذیب و تمدن کی بناء ڈالی جہاں ملک و نسب اور قریشی و غیر قریشی کا فرق ختم ہو گیا۔ امیر و غریب کی دوئی غائب ہو گئی، غلام و آقا ایک ہی دستر خوان پر کھانا تناول کرتے تھے۔ رنگ و نسل اور عرب و عجم کا امتیاز حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر ابو جہل کی روح چیخ اٹھتی ہے۔

مذہب او قاطع ملک و نسب
از قریش و منکرِ فضل عرب

درنگاہِ اُو یکے بلا و پست
باغلام خویش بریک خوان نشَست
قدر احرارِ عرب نشناختہ
باکُلفتانِ حبش درساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند
آبُروے دود مانے ریختند
این مساوات این مواخات اعجمی است
خوب می دانم کہ سلمانؓ مزد کی است
اعجمی را اصل عدنانی کجاست
گنگ را گفتار سَحبَانی کجاست ؎

پروفیسر حسین مجیب نے حلاّج کے متعلق اقبالؔ کے خیالات پر بھی بحث کی ہے۔ حلاّج دوسرے صوفیہ کے برعکس اپنے خیالات ومشاہدات کو عوام تک پہنچانا چاہتے تھے۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا مگر اقبالؔ کے خیال میں حلاّج کے کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ خدا نیک انسان کے قلب میں ہے۔ نتیجتاً ایک نیک انسان خدا کو دنیا کے سامنے عیاں کرتا ہے۔ عبد و معبود باہم دگر مربوط ہوتے ہیں اور ایک حیات اختیار کرتے ہیں۔ شاعرانہ تخیل

سے عاری فقہاء نے حلاج کو غلط سمجھا اور اُسے موت کے گھاٹ اتروادیا۔^8^ مگر اقبالؔ حلاج کے نقطۂ نظر کا دفاع کرتے ہیں اور اُن کی تعریف میں رطب اللّسان ہیں۔

کم بگوزان خواجہ اہل فراق
تشنہ کام و از ازل خونیں ایاق
ماجہول او عارف بود و نبود
کفر او ایں راز رابَر ماکشود
از فتادن لذتِ بر خاستن
عیش افزو دن زدرد کاستن
عاشقی درنارِ او واسوختن
سوختن بے نار او ناسوختن
زانکہ او درعشق و خدمت اقدم است
آدم از اسرار او نامحرم است
چاک کُن پیراہن تقلیدرا
تابیا موزی از و توحیدرا ۹

پروفیسر حسین مُجیب کے خیال میں ان اشعار سے اقبالؔ کی آزادیٔ فکر

ظاہر ہوتی ہے اور اس سے ان کے اس عزم و ہمت کا اندازہ ہوتا ہے جو ان کے اندر حق کے اظہار اور جبر و ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے پائی جاتی تھی ۔[۱۰] اقبالؔ نے اپنی کتاب ارمغان حجاز میں جو ان کے انتقال کے چند ہی ماہ بعد منظر عام پر آئی، حلاج سے متعلق ''انا الحق'' کے عنوان کے تحت سات رباعیاں موزون کی ہیں، اقبالؔ کے نزدیک یہ مقام کبریا ہے اگر چہ اس کے قائل کو دار کی آزمائش سے بھی گزرنا پڑے۔

پروفیسر حسین مجیب کا خیال ہے کہ حلاج کا ''انا الحق'' اقبالؔ کے نظریۂ خودی کے مماثل ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک انسانی خودی مقدّس شے ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ فرد اور سماج اس کے عُمق میں غوطہ زن ہو کر اس سے وہ قوت و حرارت حاصل کریں جو اس کے اندر مستور ہے، جو قوم خودی کو اپنا مطمع نظر بناتی ہے وہ دنیا کی دوسری قوموں کی امام بن جاتی ہے۔ اس کے نزدیک تساہل یا آرام حرام ہے، وہ طائرِ آفاق ہونے کے باوجود اپنی اصل سے بے نیاز نہیں۔ چاند اور تاروں کو مسخر کر سکتی ہے اور اسی کے ہاتھ میں دنیا کی زمام کار ہوتی ہے۔[۱۱]

با آن ملت انا الحق ساز گار است
کہ از خُونَش نم ہر شاخسار است

نہاں اندر جلال او جمالے
کہ اور اُنہ سپہر آئینہ دار است ۱۲

اقبالؔ کی تقریباً ساری شاعری پر نظریۂ خودی چھایا ہوا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اقوام عالم اس فلسفہ کو اپنی قومی زندگی میں اپنائیں، پروفیسر حسین مجیب کے نزدیک چونکہ اقبالؔ کا نظریۂ خودی ''انا الحق'' کے قریب ہے اس لئے وہ حلاؔج کے جُرم کے مُنکر ہیں اور اُس مذمت کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے جس کا شکار حلاؔج کو ہونا پڑا۔ اقبالؔ کے نزدیک وہ قوم جو خودی میں ایمان نہیں رکھتی کافر ہے۔ اگرچہ اس نے دینداری کا لبادہ ہی کیوں نہ اوڑھ لیا ہو، حلاؔج کے مخالفین کو خاموش کرنے کے لئے اقبالؔ حلاؔج کی زبانی کہتے ہیں۔

بود اندر سینۂ من بانگ صور
ملتے دیدم کہ دارد قصد گور
مومنان باخوی و بوئے کافران
لاالہٰ گویاں واز خود منکران
من بخود افروختم نار حیات
مردہ راگفتم زِاسرار حیات

من زنور ونار او دادم خبر
بندۂ محرم! گناہ من نگر![۱۳]

اقبالؔ نے ارمغان حجاز میں شعرائے عرب سے خاص طور پر خطاب کیا ہے اور انھیں بتایا ہے کہ میرے نزدیک لعلِ لب، ہیچ و بے قیمت ہے اور نور قرآن نے جب سے میرے دل کو فروغ دیا ہے اس وقت سے میں نے شب تاریک کو سحر کر لیا ہے۔

بگواز من نواخوانِ عرب را
بہاے کم نہادم لعل لب را
ازان نورے کہ از قرآن گرفتم
سحر کردم صدوسی سالہ شب را[۱۴]

اقبالؔ شعرائے عرب سے خطاب کرتے ہیں کہ صورت نگار بننے کے بجائے انہیں حسنِ معنی پر نظر رکھنی چاہئے اور اپنے من میں ڈوب کر سراغ زندگی پالینا چاہئے اور اپنے ''سوز و سازِ نغمہ'' سے دل مسلم کو ابھارنا چاہئے۔

تو ہم بگزار آں صورت نگاری
مجو غیر از ضمیرِ خویش یاری

بباغِ ما برآور دی پر و بال
مسلمان رابدہ سوزے کہ داری ۱۵

اقبالؔ کو عربوں کے مصائب اور مشکلات کا کرب ستائے رہتا تھا جس سے عرب سیاسی، سماجی اور اقتصادی طور پر دوچار تھے انہیں عربوں کے اختلافات اور باہمی نزاع سے بڑا قلق ہوتا تھا اس سے ماضی میں بھی انہیں نقصان پہنچا۔ عرب ان سارے جھگڑوں سے باز رہ سکتے تھے کیونکہ اسلام نے انہیں امن و آشتی اور محبت و اتحاد سے رہنے کی تلقین کی تھی، اسی لئے اقبالؔ عربوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ اتحاد و اتفاق سے رہنے کے لئے انہیں اسلام کے ساتھ مضبوط رشتہ استوار کرنا چاہئے۔ وہ اس بات پر عربوں کی ملامت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اسلاف کی راہ چھوڑ کر اغیار کی پیروی شروع کردی جس کے نتیجے میں انہیں خسران سے دوچار ہونا پڑا۔ اقبالؔ امرائے عرب سے یاددہانی کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

کرے یہ کافر ہندی بھی جرأت گفتار
اگر نہ ہوا مرائے عرب کی بے ادبی
یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کِس اُمت کو
وصال مصطفویؐ، افتراق بولہبی

نہیں وجود حدود و ثغور سے اسکا
محمدؐ عربی سے ہے عالم عربی [16]

ضرب کلیم کی ''شام و فلسطین'' والی نظم میں اقبالؔ نے حلب پر فرنگیوں کے قبضہ اور اخلاق سوز عادات کو عام کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی نظم میں اقبالؔ نے مسئلہ فلسطین کو بھی چھیڑا ہے اور بجا طور پر کہا ہے کہ اگر فلسطین پر یہودیوں کا حق ہے تو ہسپانیہ پر مسلمانوں کا حق کیوں نہیں ہے ۔

رِندانِ فرانس کا میخانہ سلامت
پُر ہے مئے گلرنگ سے ہر شیشہ حلب کا
ہے خاک فلسطین پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہل عرب کا
مقصد ہے ملوکیت انگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں تاریخ کا یا شہدو رطب کا [17]

پروفیسر حسین مجیب نے اقبالؔ کی اس تنقید کا تفصیلی ذکر کیا ہے جو اقبالؔ نے سامراجیوں پر کی ہے کہ غاصب عربوں کے ساتھ ہمدردی جتلاتے ہیں مگر

اصلاً ان کو تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں۔ اقبالؔ جب فلسطینی عربوں سے خطاب کرتے ہیں تو انہیں اپنے حقوق کی بازیابی اور یہودیوں سے بغاوت کرنے پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ ظالم ان کے وطن عزیز کو ہڑپ کرنا چاہتے ہیں۔ اقبالؔ اپنی عادت کے مُطابق فلسطینیوں کی توجہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی طرف منعطف کرتے ہیں جن کے زورِ ایمان نے تاریخ کے رُخ کو اپنی مرضی کے مُطابق موڑ دیا۔ یہ لوگ عزمِ صمیم اور جوش و جذبہ کی حرارت سے معمور تھے۔ یہی حرارت اور آگ فلسطینی عربوں کے دلوں میں بھی شعلہ بار ہونی چاہئے۔ ۱۸ اقبالؔ کے نزدیک لندن اور جنیوا کی کانفرنسیں بیکار ہیں اور اُن سے مسئلہ کا کوئی حل نکلنے والا نہیں۔ کیونکہ فرنگ کی رگِ جان یہود کے پنجہ میں ہے۔

زمانہ اب بھی نہیں جسکے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش تیرے وجود میں ہے
تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جان پنجہ یہود میں ہے
سُنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش ولذتِ نمود میں ہے ۱۹

اقبالؔ عربوں کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ انہیں دنیا میں عزّت وآبرو کا مقام حاصل کرنے کے لئے اسلام سے راہنمائی حاصِل کرنی چاہئے۔ وہ انہیں یورپ کی نقالی سے خبردار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سامراجی طاقتیں ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے اوران میں انتشاروافتراق پیدا کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگارہی ہیں یہ سامراجی قوتیں عربوں کی عزت و دولت کو لوٹ لینا چاہتی ہیں۔ اقبالؔ عربوں کو یاد دلاتے ہیں کہ اُن کی گزشتہ عظمت اسلام کی وجہ سے تھی اورانہوں نے ہی سب سے پہلے لا الٰہ الا اللہ کا انقلاب آفرین نظریۂ حیات دنیا کے سامنے پیش کر کے اقوام عالم کی رہبری کی، چنانچہ پس چہ باید کرد میں نغمہ کُناں ہیں۔

رمز اِلا اللہ کرا آمو ختند؟
این چراغ اول کجا افرو ختند؟
ازدم سیراب آن امی لقب
لالۂ رست ازریگِ صحرائے عرب
اے زِافسونِ فرنگی بے خبر
فتنہ ہا در آستینِ اونگر
از فریبِ او اگر خواہی امان
اشترانش رازِ حوضِ خود بران

حِکمتش ہر قوم رابیچارہ کرد
وحدتِ اعرابیاں صد پارہ کرد [۲۰]

اقبالؔ کو عربوں کی بے چارگی پر بہت ذہنی تکلیف ہوتی ہے اور وہ انہیں اپنی تقدیر نہ بدلنے پر ملامت کرتے ہیں مگر مایوسی کے بائے وہ انہیں اُمید دلاتے ہیں کہ مصیبت کی تاریکی کے بعد راحت کی نئی روشنی پھوٹنے والی ہے۔

اے جہان مومنانِ مشک فام
ازتومی آید مرا بوئے دوام
زندگانی تاکجا بے ذوق سیر
تاکجا تقدیر تو دردستِ غیر
ازبلا ترسی؟ حدیث مصطفٰے است
مرد را روز بلا روز صفاست [۲۱]

اقبالؔ نے عربوں کے حوالے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر حسین مجیب رقمطراز ہیں کہ اقبالؔ عربوں کے ایک دردمند مورخ ہیں، جنہوں نے عربوں کے ماضی اور حال کے مسائل پر دلسوزی اور پوری

گہرائی کے ساتھ جائزہ لے کر ان کا حل تلاش کیا ہے اور اپنی شاعری کو اپنے خیالات کا وسیلہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔[۲۲] آج کے دور میں انہی خیالات کی بدولت اقبالؔ کی اہمیت اور معنویت پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

حوالے

۱۔ مصری، حسین مجیب، اقبال والعالم العربی، قاہرہ ۱۹۷۶ء، ص ۱۴

۲۔ کتابیات اقبال، ترتیب، ہاشمی رفیع الدین، پاکستان۔

۳۔ ندوی، ابوالحسن علی، نقوش اقبال، لکھنو ۱۹۷۲ء ص ۲۸

۴۔ رموزِ بے خودی، شرح چشتی، یوسف سلیم، سرینگر ۱۹۷۴ء، ص ۴۱

۵۔ چشتی، کوسف سلیم، شرح جرب کلیم، دہلی ۱۹۷۰ء ص ۳۳

۶۔ جاوید نامہ (کلیات اقبال فارسی لاہور) ۱۹۸۵ء ص ۵۴

۷۔ ایضاً، ص ۵۵

۸۔ حسین مجیب، ص ۲۰

۹۔ جاوید نامہ (کلیات) ص ۱۳۳

۱۰۔ اقبال والعالم العربی، ص ۲۰۔۲۱

۱۱۔ اقبال والعالم العربی، ص۔۲۲

۱۲۔ ارمغانِ حجاز، لاہور ۱۹۵۹ء ص ۹۷

۱۳۔ جاوید نامہ (کلیات فارسی) ص ۱۲۳

۱۴۔ ارمغان حجاز، ص ۱۱۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۱۶ ضرب کلیم، دہلی ۱۹۸۱ء، ص ۶۳

۱۷ ایضاً، ص ص ۱۵۶۔۱۵۷

۱۸ ضرب کلیم، دہلی ۱۹۸۱ء، ص۔۳۰

۱۹ ایضاً، ص ص ۱۵۹۔۱۶۰

۲۰ پس چہ باید کرد (کلیات فارسی) ص ص ۳۹۔۴۱

۲۱ جاوید نامہ (کلیات فارسی) ص ص ۹۷۔۹۸

۲۲ اقبال والعالم العربی، ص ص ۳۶۔۳۷

مصر میں اقبالیات

مصر کو خریطۂ عالم میں بالعموم اور عالم اِسلام میں بالخصوص اپنی علمی، ادبی، ثقافتی اور مذہبی اہمیت کی وجہ سے ایک ممتاز مقام حاصِل ہے۔ اس ملک میں تجدید واحیائے دین کی اسلامی تحریکیں بھی سرگرم کار رہی ہیں اور جمال الدّین افغانی جیسے اِنقلاب آفرین رہنما بھی اسی ملک میں اپنے افکار کی اشاعت کرتے رہے ہیں۔ اقبالؔ کو اسی عظمت کے پیش نظر مصر سے تعلّقِ خاطر رہا ہے۔ انہوں نے جابجا اَپنے کلام میں آثارِ مصر کو نمایاں طور پر جگہ دی ہے۔ اہرام مِصر کے بارے میں لِکھتے ہیں ؎

اس دشتِ جگر تاب کی خاموش فضا میں
فطرت نے فقط ریت کے ٹیلے کئے تعمیر
اہرام کی عظمت سے نگوں سار ہیں افلاک
کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر
فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہُنر کو
صیّاد ہیں مردانِ ہُنر مند کہ نخچیر [1]

اقبالؔ عالم اِسلام کو ایک ہی لڑی میں پرو دینے کا جو خواب دیکھ رہے تھے اس کا آغاز بھی وہ مصر سے کر دینا چاہتے تھے۔ اپنی اس تمنا کا اظہار انہوں نے اس شعر میں کیا ہے۔

ایک ہوں مُسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحِل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

اقبالؔ نے مصری عُلمائے دین سے بھی رابطہ رکھا تھا اور ضرورت پڑنے پر اُن سے استفادہ بھی کرتے اور مدد کے طلب گار بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں ہندو معاشرے کی طبقاتی جنگ کے ستائے ہوئے اچھوتوں نے ایک اجتماع کے بعد جب اس فیصلے کا اعلان کیا کہ وہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی چیرہ دستیوں اور سنگدلانہ برتاو سے تنگ آ چکے ہیں اور کسی نئے مذہب کی آغوش میں پناہ لینے کی خواہش رکھتے ہیں تو عیسائی مشنریوں کی بے پناہ سَرگرمیوں کے جواب میں دردمند مُسلمانوں نے بھی تبلیغ اسلام کے بارے میں مقدور بھر کوششیں شروع کر دی تھیں۔ شاعرِ اسلام علاّمہ محمد اقبالؔ بھی ان دردمندوں میں شامِل تھے، چنانچہ مسلمان مُبلغّین کی تربیت کے لئے انہوں نے ایک تربیتی ادارہ کھولنے کا فیصلہ کیا اور علمی و روحانی راہنمائی کے لئے اُن کی نگاہیں عالمِ اسلام کی

عظیم درسگاہ الازہر یونیورسٹی کی طرف ہی اٹھیں اور انہوں نے اس زمانے کے شیخ الازہر علاّمہ محمد مُصطفٰے المراغی سے درخواست کی کہ اس تربیتی ادارۂ مبلّغین اسلام کی رہنمائی کے لئے الازہر کے کسی ایسے عالم کی خدمات مہیّا کی جائیں جو دینی علوم اور عصری تقاضوں پر گہری نظر کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان سے بھی واقف ہو''۔ ۲

اقبالؔ کو عالمِ عربی میں متعارف کرنے کا سہرا بھی مصر ہی کے سر جاتا ہے مِصر کے ہی ایک گُلِ سرسبد پروفیسر عبدالوہاب عزام نے اپنا مشغلۂ حیات ہی یہ بنایا تھا کہ وہ اقبالؔ کے پیغام اور شاعری کو عرب عوام کے سامنے پیش کرے۔ پروفیسر عزام کا ایک کامیاب سفارت کار ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ پائے کا شاعر، فلسفی، ماہر تعلیم اور متصوف عالم تھے۔ اقبالؔ سے اَپنے تعلق خاطر کے سِلسلہ میں ''پیام مشرق'' کے عربی ترجمہ کے دیباچے میں رقمطراز ہیں:۔

''کوئی بیس سال قبل (۱۵ء سے قبل) میں نے لندن میں اقبالؔ کا نام سُنا، مجھے یاد ہے کہ ایک دن مدرسۂ دراسات شرقیہ (School of Oriental Studies) میں ایک ہندوستانی جوان نے اقبالؔ پر تقریر کی مگر اس کے لہجے اور عُجلت کلام کی وجہ سے میرے دماغ میں کوئی بات اثر نہ کرسکی اور میں اقبالؔ کے بارے میں کوئی تاثر قائم کرنے سے قاصِر رہا۔ یہی رائے نشست میں موجود سر ڈینی نس راس کی بھی تھی۔

دن بیتتے گئے اور اقبالؔ کے بارے میں میری معلومات میں کوئی اضافہ نہ ہوسکا۔ قیام مِصر کے دوران ترکی کے شاعر اسلام محمد عاتف سے میری ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اور ہم عربی فارسی اور ترکی شعروادب پر گفتگو کرتے رہتے۔ اسی دوران انہوں نے ایک دن ''پیام مشرق'' کا ایک نُسخہ لایا۔ ہم اسے اکٹھے پڑھتے رہے۔ میں اس شاعری سے کافی محظوظ ہوا۔ اس کے بعد قاہرہ میں مقیم ایک ہندوستانی دوست نے مُجھے اقبالؔ کے دو منظومے ''اسرار خودی'' اور ''رموز بے خودی'' مرحمت فرمائے۔ میں اس شاعری سے ایک عاشقِ صادق اور مئے حیات کے پیاسے کی طرح استلذاذ کرتا رہا۔ مجھے اس میں وہ چیز نظر آئی جو کہیں اور دکھائی نہیں دی اور اس چیز نے مُجھے ان کا گرویدہ بنالیا۔[۳]

عزامؔ نے اقبالؔ پر گرانقدر مقالات کا آغاز قاہرہ کے مؤقر جریدے 'الرسالتہ' میں کیا۔ ان مقالات کے اچھے اثرات مرتب ہوئے۔ مصری علماء و فضلا اقبال کی شاعری اور افکار کا زیادہ توجہ اور انہماک سے مُطالعہ کرنے لگے اور اپنی تحقیقات اور تاثرات کو قارئین کے سامنے پیش کرنے لگے۔

مقالات کے علاوہ عزامؔ مختلف ادبی و علمی محفلوں میں اقبالؔ کے شعر و فکر پر بڑی پُر مغز اور دلآویز تقاریر بھی کرتے رہے۔ اپریل ۳۸ء میں اقبالؔ کی وفات پر قاہرہ اور اسکندریہ میں جن تعزیتی محافِل اور مجالس کا انعقاد ہوا، ان میں ڈاکٹر عزامؔ کا بڑا ہاتھ تھا۔ اسی سلسلہ میں بیت المقدس میں جو تعزیتی جلسہ منعقد ہوا اس

میں پروفیسر عزام کو بطورِ خصوصی مُقرِّر مدعو کیا گیا۔ اس موقعہ پر انہوں نے اپنے احساسات کا اظہار یوں کیا۔

"...مات رجل" كان على هذه الارض عالماً روحياً يحاول أن ينشيئ الناس نشأة أخرى، ويسن لهم فى الحياة سنة جديدة، وسكن فكر ٠وال جمع ماشاعت له قدرته من معارف الشرق والغرب. ثم نقدها غير مستاسر لمايؤشر مِن مذاهب الفلاسفه ولا مستكين لمايروى من اقوال العظماء. ووقف قلب كبير كان يحاول أن يصوغ الامة الا سلامية من كل ماوعىَ التاريخ من مآثر الابطال واعمال العُظماء، وقرت نفس حرة لايحد هازمان ولا مكان، ولايأ سرها ماض ولاحاضر، فهى طليقة بين الاوّل والأبد، خفاقة فى ملكوت اللّٰهِ الذى لايَحد" ؎

۱۹۴۷ء میں جب عزّام علی اصغر حکمت کی معیت میں لاہور میں مزار اقبالؔ پر حاضر ہوئے تو لوحِ مرمر پر مرتسم اپنے احساسات کو یوں پیش کیا۔

عربى يهدى لروضك زهرا
ذافخار بروضه واعتراز

كلمات تضمنت كل معنى

مِن ديار الاسلام فى ايجاز

بلسان القرآن خطت ففيها

نفحات التنزيل والاعجاز

فاقبلنها على ضالة قدرى

فهى فى الحق "ارمغان الحجاز" ۵

تقاریراور مقالات کے علاوہ عزام نے ''پیام مشرق'' ''ضرب کلیم'' ''اسرارخودی'' ''رموز بےخودی'' اور ''جاوید نامہ'' کے کچھ حصوں کا منظوم ترجمہ دنیائے عرب کے سامنے پیش کیا۔ سیدّ ابوالحسن علی ندوی کی رائے میں عزآم کے ترجمہ علم وفہم اوران کی نظم میں کوئی خامی نہیں بلکہ اصل خرابی یہ ہے کہ انہوں نے منظوم ترجمے کا بیڑہ اُٹھا کر اپنے ساتھ انصاف نہیں کیا جس سے اصل اور نقل دونوں کی خوبیاں سامنے نہ آسکیں اور کہیں کہیں ژولیدگی نے اس پر اور اضافہ کیا جو قاری اور ذوق شعری کے دَرمیان حائل ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر عزآم کی خدمت اسلام اورادب کی ایک بڑی خدمت ہے جو ہر قدردانی اور شکر و اعتراف کی مستحق ہے اورخودان کی عربیت، ان کے حُسن طبیعت، عزم واخلاص اور اسلامی فکر سے محبت کی دلیل ہے۔ یہ اقبآل کی خوش نصیبی تھی کہ انہیں عزام

ساتر جمان ملا۔ اقبال کی روح ان کی اس محبت سے یقیناً مسرور ہورہی ہوگی۔ ۶

عزام کے تراجم کے بعد مصر سے ہی محمد حسین الاعظمی اور شیخ صاوی شعلان کے ترجمے ہمارے سامنے آئے۔ شیخ صاوی شعلان کے تراجم واقعی بے مثال ترجمے ہیں۔ لگتا ہے کہ اس نابینا شاعر پر وہ سارے معانی الہام ہوئے تھے۔ جو اقبالؔ اپنے قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔

شیخ صاوی شعلان کا ترجمہ کرنے کا ایک مخصوص اسلوب ہے۔ وہ پہلے شعر اقبالؔ کا نثر میں ترجمہ کرتے ہیں اور اس کے بعد نظم میں۔ اس طرح قارئین کے سامنے بیک وقت دو ترجمے ہوتے ہیں چنانچہ اُن کے بیسیوں مقالات اسی نہج پر قاہرہ کے جریدہ ''منبر الاسلام'' میں چھپتے رہے۔ شعلان کے یہ تراجم ''ایوان اقبال'' کے نام سے قارئین کے سامنے آگئے ہیں۔ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کے الفاظ میں اقبال کو عرب دنیا میں مقبول و متعارف کرنے والی دو اہم شخصیات شیخ صاوی شعلان اور ستارۂ مشرق اُمّ کلثوم ہیں۔ کلام اقبالؔ کا عربی اشعار میں بہترین بلکہ بے مثال ترجمہ صاوی شعلان ہی نے کیا ہے۔ وہ ایک فصیح و بلیغ پختہ شاعر ہیں اور کلام اقبالؔ کو اس نے بڑی خوبصورتی اور بے ساختگی کے ساتھ عربی میں منتقل کیا ہے۔ اس نے ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' کا ترجمہ ''حدیث الروح'' کے عنوان سے کیا ہے اور کمال کر دکھایا ہے اس میں اصالت کے ساتھ لفظ و معنی کا اتنا خوبصورت انداز اختیار کیا گیا ہے کہ ترجمہ کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ پھر جب اس

''حدیث الروح'' کو اُمّ کلثوم کی ساحرانہ آواز عطا ہوئی تو عرب دُنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اقبالؔ کو بچّہ بچّہ جان گیا۔ ''حدیث الروح'' کا مصنف اقبالؔ آج عرب دنیا کا شاعر متصور ہوتا ہے اور عوام وخواص کی زبان پر اس کے اشعار ہر طرف سنائی دیتے ہیں۔ ''حدیث الروح'' کے علاوہ شعلان نے اقبال کی زندگی اور فن پر بھی ایک کتاب ''فلسفہ اقبالؔ'' کے نام سے عربی قارئین کے سامنے پیش کی جو ۱۹۵۰ء میں قاہرہ سے شائع ہوئی۔ ۱۹۵۴ء میں عبدالوہاب عزام ایک اور کتاب ''محمد اقبالؔ۔ سیرتہ' فلسفۃ' و شعرہ'' لے کر ہمارے سامنے آئے جس میں اقبالؔ کی زندگی، فلسفہ اور شاعری کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ مصر کے نامور نابینا محقق، ادیب اور نقاد ڈاکٹر طٰہٰ حُسین نے تحریر کیا ہے اور اس احسانِ عظیم کا اعتراف کیا ہے جو اقبالؔ کے حوالہ سے عزام کا عربوں پر ہے۔ ۱۹۵۵ء میں اقبالؔ کی اہم نثری تصنیف ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کا عباس محمود کا کیا ہوا عربی ترجمہ ''تجدید التفکیر الدنیی فی الاسلام'' کے نام سے مِصر سے ہی شائع ہوا۔ عزامؔ کی کتاب اور تشکیل جدید'' کا ترجمہ سامنے آنے سے علمائے مصر اقبالؔ کے افکار کی طرف زیادہ توجہ اور تنقید کے ساتھ آئے، چنانچہ شیخ عبدالعزیز المراغی، ڈاکٹر محمد البہی اور ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے اقبالؔ کی بعض آرا پر تنقید کی جو پروفیسر محمد السعید جمال الدین کی رائے میں بجا تنقید نہیں ہے کیونکہ

محض دو ایک کتابوں کا مطالعہ کر کے اقبالؔ کے بارے میں متوازن رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ ۸

پیغام اقبالؔ کو عام کرنے میں مصر کی اُن جامعات، انجمنوں اور علمی اور ثقافتی تنظیموں کا بڑا دخل رہا ہے جو ہر سال اقبالؔ کی وفات کے موقع پر محفلوں اور جلسوں کا اہتمام کرتی رہتی ہیں۔ الازہر یونیورسٹی اور دیگر مصری جامعات، دینی تنظیموں اور سفارت خانہ پاکستان قاہرہ میں ہر سال اقبالؔ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے مختلف محفلوں کا انعقاد کرتے رہتے ہیں۔

مصری یونیورسٹیوں میں محفل اقبالؔ منانے کے ساتھ ہی اقبالؔ پر تحقیقی، تخصیصی مطالعات کو بھی تحریک ملی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے عین شمس یونیورسٹی قاہرہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ کے لئے ''جاوید نامہ'' کا انتخاب کیا گیا۔ یہ تحقیقی مقالہ اسی یونیورسٹی کے پروفیسر محمد السعید جمال الدین نے ''جاوید نامہ. دراسته تحلیلیه و نقدیه'' کے عنوان سے پیش کیا جو ۱۹۷۴ء میں ''رسالة الخلود'' کے نام سے شائع ہو کر قارئین سے داد تحسین حاصل کر چکا ہے۔ قاہرہ یونیورسٹی میں درجہ ماجستیر (ایم اے) کے لئے سمیر عبدالحمید نے اَپنے تحقیقی مطالعہ کے لئے ''ارمغان حجاز'' کا انتخاب کیا۔ اس مُطالعہ میں انہوں نے اقبالؔ کے عصر وحیات اور ادب وشعر کے علاوہ ارمغان حجاز کا ترجمہ اور تحلیلی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ''اسرار ورموز'' کے ان اشعار کا نثری ترجمہ

بھی شائع کرایا جن کا ترجمہ عزّام نے دانستہ طور پر یا سہواً نہیں کیا تھا۔

اقبالؔ اور دیگر شعرائے اسلامیین کے تقابلی مطالعہ کا بھی آغاز ہوا چنانچہ عین شمس یونیورسٹی میں درجۂ ماجستیر کے لئے ''المعراج فی الآداب الاسلامیہ'' کا موضوع منتخب کیا گیا اس میں اصلاً ''جاوید نامہ'' ہی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اقبالؔ اور معاصر مصری شاعر۔ احمد شوقی کا تقابلی مُطالعہ بھی کرایا گیا۔ قاہرہ یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ میں ''محمد اقبالؔ والفکر الاسلامی'' کے عنوان سے تحقیقی کام کا آغاز کر دیا گیا۔۹

مِصر میں اقبالیات کے حوالے سے پروفیسر حسین مُجیب المصری کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ پروفیسر موصوف کو کلام اقبالؔ سے والہانہ شغف ہے۔ انہوں نے کلام اقبال کا منظوم ترجمہ موجود ہونے کے باوجود نئے سرے سے ''جاوید نامہ'' کا منظوم ترجمہ ''فی السماء'' ''ارمغان حجاز'' کا ''ھدیۃ الحجاز'' اور ''گلشن راز جدید'' کا روضۃ الاسرار'' کے نام سے کیا ہے۔ ان تراجم کے علاوہ اقبالؔ پر ان کی سات کتابیں قارئین کے سامنے آئی ہیں جن میں سے تین کتابیں ''اقبال والعالم العربی'' اور ''اقبالؔ والقرآن'' اور اقبالؔ بین المصلحین الاسلامیین'' اس مقالہ نگار کے زیر مُطالعہ رہی ہیں۔

اقبالؔ کے نظریہ خودی اور تصورِ مردِ مومن کو اُن اسلامی اور اصلاحی تحریکوں میں زبردست قبولیت حاصِل ہوئی جو ہر سماجی اور سیاسی اصلاح کے لئے دین کو

اساس قرار دیتی ہیں۔ ان تحریکوں میں اخوان المسلمون کا نام سرفہرست ہے اخوانی حضرات اِنفرادی اور اجتماعی طور پر فکر اقبالؔ سے خاصے متاثر نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے بچوں کے نام تبرکاً اقبالؔ کے نام پر رکھتے ہیں۔ ان کی نظروں میں حقیقی شعر اِسلامی کی بہترین مثالیں کلام اقبالؔ میں ہی مِلتی ہیں۔[۱۰]

سیّد قطب اقبالؔ کی اِسلامی فکری خدمات سے متاثر اور انہیں ہندو پاک میں کارِتجدید اور بیداری اُمّت کے موسسین میں شمار کرتے ہیں تاہم علامہ اقبالؔ سے جہاں کہیں چوک ہوئی ہے اس پر فاضِل مصنف نے گرفت بھی کی ہے۔ ''سیدّ قُطب کے نزدیک اقبالؒ نے عالم شرق میں فکری انحرافات کا مقابلہ کیا اور عجمی تصوف کے اثرات سے انہیں معاملہ پیش آیا تو انہیں ''فنا'' کا وہ تصور بڑا خطرناک نظر آیا جس میں انسانی ذات کا کوئی وجود نہیں رہتا۔ اس طرح ''اس سلبیت'' کو بھی آپ نے مُضر خیال کیا، جس کی موجودگی میں اِنسان عمل واقدام سے بھاگتا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر اقبالؔ کو دوسری طرف دنیوی قوانین کی حسی تفکیر اور عالم مغرب میں تجربیوں کے مسلک سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ اسی طرح نٹشے کے فلسفے کا بھی انہوں نے گہرائی سے جائزہ لیا۔

سیدّ قطب کے خیال میں اقبالؔ نے فِکر اسلامی اور اِسلامی زندگی کے اندر سلبیت، فنا اور ضیاع کی تردید شروع کی اور اسلام کی تجرباتی واقعیت کا اثبات کیا لیکن ایسا کرنے سے اِنسانی ذات نمایاں ہوکر سامنے آگئی اور انہیں قرآن کی

بہت سی آیات ونصوص کی تاویل ایسی کرنی پڑی جوان کے مزاج وطبیعت سے میل نہ کھاتی تھی نہ تصور اسلامی کی روح سے اس کا کوئی رشتہ سمجھ میں آتا تھا۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ موت تجربہ کی انتہا نہیں ہے نہ قیامت تجربات کو اختتام کو پہنچاتی ہے۔ انسانی ذات میں تجربہ، نمو اور ارتقاء کا سلسلہ اقبالؔ کے نزدیک جنّت وجہنم کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ سیدّ قطب کے نزدیک یہ غلُو اور انتہا پسندی محض ''وجود'' یعنی انا کے ذاتی اثبات اور اس کے استمرار کے ثبوت کے لئے ہی درآئی جیسا کہ اقبالؔ نے ہیگل کی فلسفیانہ اصطلاحات سے بہت کچھ مستعار لیا تھا''۔[11]

ایک اور اخوانی مُصنّف ڈاکٹر نجیب الکیلانی مرحوم نے جیل ہی میں اقبالؔ پر ''اقبالؔ۔ الشاعر الثائر'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جس میں اقبالؔ کے فلسفہ خودی، اقبالؔ کے نظریہ شعر، اقبالؔ اور عورت قلندری فقر اور شعر اقبالؔ میں انسانی اور علمی رجحانات جیسے موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر مرحوم کی اس کتاب کو شرف قبولیت حاصل ہوا اور ۱۹۶۶ء میں اسے ادبی انعام سے بھی نوازا گیا۔

نامور اِخوانی مفکر محمد قطبؔ نے اپنی زیرنگرانی اقبالؔ پر ایک اہم تحقیقی کام کرایا یہ تحقیقی مقالہ ''**محمد اقبالؔ و موقفه من الحضارة الغربية**'' کے نام سے مکہ مکرمّہ سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

اس مختصر سے جائزہ سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ مصر میں اقبالؔ کس قدر مقبول ہیں۔ وہ نہ صرف مصری عوام کے پسندیدہ شاعر ہیں بلکہ مصر کی علمی، ادبی اور اصلاحی تحریکوں کے پیچھے بھی ان کے افکار کا بھی بڑا دخل رہا ہے۔ اصل چیز اقبالؔ کے افکار ہی ہیں جنہوں نے اقبالؔ کو دوام اور قبولیت تام سے ہمکنار کر دیا ہے۔

حوالے

۱۔ کلیات اقبال (اردو) مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی مارچ ۱۹۹۳ء۔ ص ۴۸۳۔

۲۔ اقبال شناسی اور جرنل ریسرچ، مرتب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ بزم اقبال لاہور ۱۹۸۹ء مقالہ از ڈاکٹر ظہور احمد اظہر۔ ص ۲۴۱۔

۳۔ پیام مشرق، مجلس اقبال کراچی پاکستان۔ سن ندارد۔ ص ۔۱

۴۔ پیام مشرق، مجلس اقبال کراچی پاکستان۔ سن ندارد۔ ص ۔۵

۵۔ پیام مشرق مجلس اقبال کراچی پاکستان۔ سن ندارد، ص ص ۶، ۷

۶۔ نقوش اقبال، لکھنو، ۱۹۷۲ء ص ص ۳۷۔۳۸

۷۔ اقبال شناسی اور جرنل ریسرچ۔ ص: ۲۵

۸۔ ابحاث۔ جامعہ پنجاب لاہور ۱۹۸۲ء ۱۴

۹۔ ابحاث۔ جامعہ پنجاب لاہور ۱۹۸۲ء ص ص: ۱۷، ۱۸

۱۰۔ ابحاث۔ ص: ۱۹

۱۱۔ ڈاکٹر عبید اللہ فہد۔ فولاد ہے مومن (سید قطب کی حیات و خدمات کا تجزیہ) ہندوستان پبلیکیشنز۔ دہلی ۱۹۹۳ء، ص ص: ۳۸۱۔۳۸۲

ڈاکٹر احمد امین کے افکار پر اقبالؔ کا اثر

فارسی و اُردو شعراء میں اقبالؔ سب سے زیادہ خوش نصیب ہیں کہ عرب دنیا نہ صرف اُن کی زندگی کے حالات اور فلسفہ و شاعری سے پوری طرح متعارف و آگاہ ہے، بلکہ ان کے تقریباً تمام شعری مجموعے عربی اشعار کے قالب میں ڈھل کر عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ چکے ہیں اور آج عربی ادب میں کئی ایک شعراء و ادباء ہیں جن کے ہاں کلامِ اقبالؔ کی روح موجزن نظر آتی ہے۔[1] اور انہوں نے اقبالؔ کو اپنی عقیدت کا خراج پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزّام نے جہاں انہیں اس روئے زمین پر اپنے آپ میں روحانیت کا ایک جہاں قرار دیا ہے[2] وہاں طٰہٰ حسین نے انہیں ایسا شاعر قرار دیا ہے جس نے دنیا سے اپنا لوہا منوایا۔[3] حسان بن ثابتؓ اگر شاعرِ رسول ﷺ ہیں تو پروفیسر زیّات کے خیال میں اقبالؔ ''شاعرِ رسالت ﷺ ہیں۔[4] محمد حسین ہیکل کے نزدیک وہ شاعرِ اسلام ہیں[5] جبکہ ڈاکٹر نجیب کیلانی انہیں شاعرِ انقلاب کے طور پر پیش کرتے ہیں[6]

زیرِ نظر مقالہ میں ہم عرب ادباء و شعراء پر اقبالؔ کے اثرات کا کوئی تفصیلی جائزہ پیش کرنے نہیں جا رہے ہیں کیوں کہ اس کے لئے ایک کتاب درکار

ہے۔البتہ ہم صرف دورِ جدید کے مصر کے صفِ اوّل کے مؤرخ، ادیب، ناقد اور کثیر التصانیف مصنف ڈاکٹر احمد امین (۱۸۷۲ء۔۱۹۵۴ء) پر اقبالؔ کے اثرات کا جائزہ لیں گے۔اس مطالعہ میں ہم نے اقبالؔ کی ''تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ'' اور احمد امین کی ''یوم الاسلام'' کے علاوہ ولیم شیفرڈ اور ڈیلیٹو خالد کے خیالات کو زیرِ نظر رکھا ہے۔

احمد امین نے اقبالؔ کا ذکر پہلی بار اپنے ایک مقالہ ''حلقة مفقودة'' میں کیا ہے، جو مصر کے مشہور جریدہ ''الرسالہ'' میں شائع ہوا۔اس مضمون میں احمد امین نے اس گم شدہ کڑی (حلقۃ مفقودۃ) پر بحث کی ہے جو مشرق و مغرب کو ملاتی ہے۔احمد امین نے اس مضمون میں لکھا ہے:

''مصر میں ہمارے یہاں ایک کڑی کی کمی ہے جو خاص طور پر ہم علمی حلقوں میں محسوس کرتے ہیں۔اس کڑی کی غیر موجودگی ہی ہمارے حقیر ہونے کی وجہ ہے۔۔۔ہم اقدار کو جنم دے سکتے ہیں نہ روح کی مناسب پرورش کر سکتے ہیں۔۔یہ کھوئی ہوئی کڑی علماء کا ایک ایسا گروہ ہے جو عربی و اسلامیات میں وقیع معلومات رکھتا ہو اور جس نے ساتھ ساتھ یورپ کے سائینسی طرز پر تعلیم حاصل کی ہو۔ایسے گروہ کے بغیر ہمارے لئے ترقی کرنا آسان نہیں۔اس وقت مصر میں ایک طرف از ہر، دار العلوم اور مدرسۃُ القضاء کے فارغ التحصیل ہیں جو جدیدیت کی زبان سے نا آشنا ہیں۔یہ لوگ فرسودہ روایات کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں جس

سے اکتاہٹ اور ناگواری محسوس ہوتی ہے۔ کانٹ، برگساں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، روایتی ادب اور اقدار کو نئے اور پُرکشش انداز میں پیش کرنے میں ناکام ہوئے ہیں اور اپنی ایک الگ دنیا میں گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف یورپی یونیورسٹیوں کے ڈگری یافتہ اور جدید مصری تعلیمی اداروں کے تربیت یافتہ ہیں۔ یہ لوگ یورپ کے سائینسی علوم، فلسفہ اور ادب کے بارے میں تفصیلی معلومات رکھتے ہیں مگر عربی زبان میں ان کا علم ناقص ہے۔ یہ لوگ دوسروں تک اپنا علم پہنچانے کے اہل نہیں ہیں۔ اس بناء پر یہ گروہ بھی عوام سے اتنا ہی دور ہے جتنا پہلے گروہ کے علماء۔ مسلم ثقافت سے یہ لوگ وحشت ناک حد تک بے خبر ہیں۔ البیرونی جیسے نابغۂ روزگار کے، جسے جرمن مستشرق سخاؤ نے تمام وقتوں کا بہترین دماغ قرار دیا ہے، نام تک سے یہ لوگ ناواقف ہیں''

احمد امین کے خیال میں قدیم و جدید کی اس خلیج کو اس کڑی سے پاٹا جا سکتا ہے جو مشرق و مغرب کو ملاتی ہو مگر جس کا عرب دنیا میں فقدان ہے۔ ؎ البتہ احمد امین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس گمشدہ کڑی کو فراہم کرنے میں ہندوستانی مسلمان مصریوں سے آگے ہیں جنہوں نے امیر علی اور محمد اقبالؔ کی شخصیتوں میں اس کڑی کو پالیا ہے۔ امیر علی اور اقبالؔ کے بارے میں احمد امین یوں رقمطراز ہیں:

''یہ دونوں بڑے عالم یورپی تعلیم کے ماہر تھے۔ اُن کے دلوں میں

اسلام کی محبت رچی بسی تھی۔ انہوں نے ایسی کتابیں تصنیف کیں جنہیں جدید تعلیم یافتہ نوجوان پڑھتے اور پسند کرتے ہیں۔ جولوگ بیالوجی اور کیمسٹری میں اختصاص رکھتے ہیں وہ ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد محسوس کرتے ہیں کہ یہ کتابیں سائینس کے قدم بہ قدم چلتی ہیں۔ اقبالؔ کی کتابوں میں ہم کانٹؔ کے فلسفے کو پاتے ہیں جس سے ہمیں یہ ثبوت ملتا ہے کہ انہوں نے کافی تحقیق کی ہے۔ وہ گوئیٹےؔ جیسے جرمن شاعر کا بہت ہی پسندیدہ طریقہ پر تجزیہ کرتے ہیں۔ وہ جب معتزلہ اور تصوف پر گفتگو کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ انہوں نے ان کی فکر کی گہرائی میں جھانک کر اُن کے جوہر کو آشکارا کر دیا ہے۔ ان کے اصولوں کو اس دانشمندی اور خوش کُن طریقہ سے پیش کرتے ہیں جس طرح یورپی علماء اپنی فلاسفی کو پیش کرتے ہیں''۔[۸]

احمد امین نے اپنی کتاب ''فجر الاسلام'' میں اقبالؔ کے مقالہ ڈاکٹریٹ بہ عنوان ''فلسفہ عجم'' کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد کہیں بھی اقبالؔ کا نام نظر نہیں آتا۔ حالانکہ احمد امین نے اقبالؔ سے خاصا اخذ واستفادہ کیا ہے۔ محققین نے اس سلسلہ میں کئی توجیہیں پیش کی ہیں۔ ڈیلٹیو خالد کے خیال میں احمد امین نے اقبالؔ کا حوالہ اس لئے نہیں دیا ہے کیوں کہ عربوں کی اکثریت خاص طور پر ازہری علماء کے نزدیک عربی زبان و بیان پر مکمل تبحّر و قدرت اسلام کے عالم و فاضل ہونے کی شرط اوّلین ہے جو اقبالؔ کو حاصل نہیں تھی۔ اگر احمد امین اپنی تحریروں میں

اقبالؔ کا حوالہ دیتے تو عرب علماء ان خیالات کو مغرب زدہ قرار دے کر قابلِ توجہ نہیں سمجھتے۔۹ ڈیلٹیو خالد کے ان خیالات کی تائید ڈاکٹر مصطفٰے السباعی کے اس انکشاف سے ہوتی ہے کہ احمد امین نے ایک دفعہ ڈاکٹر حسن عبدالقادر کو یہ نصیحت کی کہ ازہری حضرات آزادانہ سائینسی خیالات کو قبول نہیں کرتے۔ مستشرقین میں جو قابلِ قدر چیزیں پاؤ گے ان کو لوگوں تک پہنچانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قارئین کے سامنے اُن چیزوں کو مستشرقین کے ساتھ منسوب نہ کیا جائے بلکہ اپنی تحقیق کے طور پر پیش کیا جائے اور ان آراء کو خوش کن الفاظ کا لباس اس طرح پہنایا جائے کہ انہیں ناگوار نہ ہو۔ بالکل یہی طریقہ ہم نے ''فجر الاسلام'' اور ''ضحیٰ الاسلام'' میں اپنایا ہے۔۱۰ البتہ ولیم شیفرڈ کی رائے ہے کہ احمد امین نے اقبالؔ کے خیالات کو اپنے اندر جذب کرنے کے بعد اپنے طور پر پیش کیا ہے اور یہ بات اقبالؔ کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ ایسا انہوں نے جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کے ساتھ بھی کیا ہے۔۱۱

بہر حال کچھ بھی ہو اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ احمد امین نے اقبالؔ سے کافی مواد لیا ہے اور اس کو اپنی تصانیف میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں احمد امین کے سب سے اہم ماخذ عبدالوہاب عزّام ہیں جو اقبالؔ کے سب سے بڑے اور پہلے عرب مترجم ہیں جنہوں نے اقبالؔ کے اشعار کو عربی کا جامہ پہنایا اور جو بیس سال سے زائد عرصہ تک احمد امین کے رفیق کار اور دوست رہے۔ اس

کے علاوہ کلام اقبالؔ کے انگریزی ترجمے ۱۹۲۰ء سے ہی آنا شروع ہو گئے تھے۔؛ اقبالؔ کی تشکیل جدید ۱۹۳۰ء ہی میں چھپ گئی تھی۔ احمد امین چونکہ انگریزی جانتے تھے اس لئے بآسانی افکارِ اقبالؔ تک رسائی حاصل کر سکتے تھے۔

اقبالؔ کے اہم ترین خیالات میں سے جن کو احمد امین نے اختیار کیا ہے، ابتدائی مسلم فکر پر یونانی فلسفہ کا اقتدار یا غلبہ ہے۔ اس خارجی عنصر نے مسلمانوں کی قرآنی بصیرت کو نقصان پہنچایا۔ اس کے خلاف اقبالؔ نے بغاوت کی اور احمد امین بھی اُن کے ہمنوا بن گئے۔ اسی طرح اقبالؔ کا استقرائی طریقہ (Induction) کو بحیثیت ایک اسلامی عرب طریقہ کے قبول کرنا اور استخراجی (Deduction) کو ایک یونانی اور یورپی طریقہ قرار دینا احمد امین کی ظہر الاسلام میں بھی دیکھا جا سکتا ہے[۱۲] جہاں وہ لکھتے ہیں کہ اسلامی طریقہ استقرائی ہے اور اسی طریقہ پر مسلم علماء عمل پیرا ہیں۔ یونانی یا یورپی فلسفہ استخراجی طریقہ پر بحث کرتا ہے۔ استقرئی طریقہ نے مسلم علماء کو شک و تجربہ کے اصول تک پہنچایا۔[۱۲](۱) یہ خیالات اقبالؔ کی صدائے بازگشت ہیں جس کا اظہار انہوں نے ''تشکیل جدید'' میں یوں کیا ہے:

''نظام ہی نے شاید سب سے پہلے یہ اصول قائم کیا تھا کہ علم کی ابتداء تشکیک سے ہوتی ہے۔ اور ''الرّد علی المنطق'' میں ابن تیمیہؒ نے بھی استقراء ہی کو حجت قابل اعتماد ٹھہرایا ہے۔ یوں اس منہج کی ابتداء ہوئی جس کا تعلق مشاہدے

اور تجربے سے ہے''[۱۳]

مزید موازنہ کے لئے ہم احمد امین کی ''یوم الاسلام'' سے اقتباس پیش کرتے ہیں:

جاحظ کی ''کتاب الحیوان'' میں ہم کئی جگہ دیکھتے ہیں وہ اپنے مشاہدات کو کسی چیز پر شک کرنے سے اور پھر شک کو جانچنے سے شروع کرتے ہیں۔ نظام نے پیغمبر ﷺ کی احادیث تک کے ساتھ ایسا ہی روّیہ روا رکھا۔ انہوں نے ان کے پایۂ اعتبار پر شک کیا پھر ان کی معقولیت جانچنے کے لئے ان کو عقل کی خراد پر چڑھایا۔ غزالی اور جاحظ نے ڈیکارٹ سے پہلے فلسفۂ تشکیک کی پیش بینی کی اور مسکویہ نے ڈارون سے پہلے ارتقاء کا نظریہ پیش کیا۔ یورپی اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ راجر بیکن پہلا شخص تھا جس نے نشاۃ ثانیہ کے دوران استقرائی طریقہ کی وکالت کی۔ وہ یہ بات پیش نظر نہیں رکھتے کہ وہ اسپین کی عرب یونیورسٹیوں کا فارغ التحصیل تھا۔ یہی بات ابن خلدون کے حق میں بھی صحیح ہے جس نے ڈیکارٹ سے قبل عمرانیات کی بنیاد ڈالی۔ دونوں کے درمیان فرق صرف یہ ہے کہ ابنِ خلدون استقرائی طریقہ تحقیق کی اتباع کرتا ہے جس کو عربوں نے استخراجی طریقہ پر ترجیح دی جس کی اہل یورپ پیروی کرتے ہیں[۱۴] یہ سطور اقبالؔ کے خطبہ ''اسلامی ثقافت کی روح'' کا بالکل نچوڑ ہیں۔

اقبالؔ نے اجتہاد پر اپنے خطبے میں اجتہاد کے معنی و مفہوم اور اس کا

دروازہ بند ہونے کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''اس میں شک نہیں کہ نظری طور پر اہل سنّت والجماعت نے اجتہاد کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ گو جب سے مذاہب اربعہ قائم ہو چکے ہیں عملاً اس کی کبھی اجازت نہیں دی۔ کیوں کہ انہوں نے اس پر کچھ ایسی شرطیں لگادی ہیں جن کا پورا کرنا ممکن تو کیا، سرے سے محال ہے''۔۱۵

احمد امین نے ''یوم الاسلام'' میں اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے:

''لَم یَبقَ فی الناس من تتوفرفیه شروط المجُتهد''۱۶

ان حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے کہ کیسے اجتہاد کا دروازہ بند ہوا اقبالؔ نے ''تشکیل جدید'' میں لکھا ہے:

''میرے نزدیک اس روش کے حقیقی اسباب حسبِ ذیل ہیں:

ہم اس عقلی تحریک (اعتزال) سے خوب واقف ہیں جس نے دولتِ عباسیہ کے ساتھ ساتھ الٰہیاتِ اسلامیہ میں سر اٹھایا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس سے بحث ونزاع کا جو سلسلہ شروع ہوا، کیسا تلخ تھا۔۔قدیم الخیال علماء کے نزدیک، جن کی آگے چل کر عباسیوں نے اس لئے حمایت کی کہ ''تحریکِ عقلیت کے اندر بعض ایسی باتیں مضمر تھیں جن کے سیاسی نتائج بڑے خطرناک ہوتے''۱۷

احمد امین نے بھی اس موضوع پر لکھا اور پہلا سبب اسی کو قرار دیا جس کا ذکر اقبالؔ نے کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"و انما أصيب المسلمون بقولهم بسد باب الاجتهاد لاسباب ثلاثة:

اولها كارثة المسلمين بضياع المعتزلة وهم الفرقة العقلية فى الاسلام و انتصار أهل الحديث عليهم"۱۸

اقبالؔ کے نزدیک رہبانی تصوف کا نشو ونما بھی' جو غیر اسلامی اثرات کے ماتحت رفتہ رفتہ صرف غور وفکر تک محدود رہ گیا' اس روش کا ایک سبب بنا۔ مذہبی پہلو سے دیکھا جائے تو تصوف عبارت ہے اس بغاوت سے جو فقہائے متقدمین کی لفظی حیلہ تراشیوں کے خلاف پیدا ہوئی۔اس سلسلہ میں سفیان ثوریؒ کی مثال ہمارے سامنے ہے جن کا شمار اس عہد کے بہترین قانونی دماغوں میں ہوتا ہے لیکن جن کے دل و دماغ پر چونکہ روحانیت کا غلبہ تھا ،لہذا فقہائے معاصرین کی خشک بحثوں سے بد دل ہو کر انہوں نے بالآخر رہبانی تصوف کا راستہ اختیار کیا۔۱۹ احمد امین نے انہی خیالات کو دوسرے سبب کے طور پر پیش کیا ہے:

"والثانی مهاجنة اهل التصوف الفقهاء بأنهم شكليون و بعون بأشكل اكثر مما يعنون بالروح،فاتفقوا مع المعتزلة فى مناهفة الفقهاء و كان على رأسهم سفيان الثورى الذى تو غل فى الروحانية مع اطلاعه الواسع فى الفقيهات"۲۰

اجتہاد کے سد باب کے سلسلہ میں اقبالؔ کے نزدیک تیسری وجہ یہ ہوئی کہ:

''تیرھویں صدی کا وسطی زمانہ آیا تو اسلامی دنیا کا ذہنی مرکز بغداد تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔۔۔اس عہد کے جن مورخوں نے تاتاری حملوں کی تاریخ لکھی ہے وہ بغداد کی تباہی کا حال بیان کرتے ہیں تو اس سے اسلام کے مستقبل کے بارے میں بڑی مایوسی ٹپکتی ہے۔لہذا یہ ایک طبعی امر تھا کہ سیاسی زوال وانحطاط سے اس دور میں قدامت پسند مفکر اپنی ساری کوششیں اس بات پر مرتکز کر دیتے کہ مسلمانوں کی حیاتِ ملّی ایک یک رنگ اور یکساں صورت اختیار کر لے۔وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح ان میں مزید انتشار پیدا نہیں ہوگا۔انہوں نے اس کا تدارک اس طرح کیا کہ فقہائے متقدمین نے قوانین شریعت کی تعبیر جس طرح کی تھی اس کو جوں کا توں برقرار رکھا اور ہر قسم کی بدعات سے پاک رکھا۔وہ چاہتے تھے جیسے بھی ممکن ہو، اسلام کی ہیئتِ اجتماعیہ محفوظ رہے اور یہ وہ بات ہے جس میں وہ کسی حد تک حق بجانب بھی تھے۔[۲۱]

احمد امین کے نزدیک بھی تیسری وجہ یہی ہے۔چنانچہ ''یوم الاسلام'' ہی میں لکھتے ہیں:

''والثالث سقوط بغداد علی ید التتر وقد کانت بغداد اذ ذاک مرکز الحضارۃ والثقافۃ الاسلامیین،فأصیب العلماء بالفزع من جراءِ هذا السقوط وغلبهم التشأوم ودوان استطاعوا

فقط حتی المحافظة القديم من تجديد وهم في ذالك معذورون بعض العذر"۲۲ے

اسلامی قانون کے دوسرے بنیادی ماخذ۔۔حدیث پر اقبالؔ نے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

عہد حاضر کے ناقدین میں سے پروفیسر گولڈزہیر نے تو اُن قوانین کی رُو سے، جن کا تعلق تاریخی تنقید سے ہے، احادیث کے بارے میں بڑے تفحص سے کام لیا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ بحیثیت مجموعی ہمیں ان کو نا قابل اعتبار ٹھہرانا چاہیے۔۔۔پھر ایک بڑا سوال یہ ہوگا کہ ان میں عرب قبل اسلام کے رسم و رواج کا جسے جوں کا توں چھوڑ دیا گیا یا جس میں حضور رسالت مآب ﷺ نے تھوڑی بہت ترمیم کر دی کس قدر حصہ موجود ہے۔۔۔اس طرح سے جو احکام وضع ہوئے (مثلاً تعزیرات) ایک لحاظ سے اسی قوم کے لئے مخصوص ہوں گے۔ پھر چونکہ احکام مقصود بالذات نہیں اس لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ آئندہ نسلوں کے لئے بھی واجب ٹھہرایا جائے"۲۳ے

احمد امین نے ان ہی خیالات کو اس طرح پیش کیا ہے:

"ورغم ان الاستاذ جولدزيهر نقدها نقداً علمياً حديثاً وأبان ان كثيرا منها فريف ماخوذ من شرائع أُخرى دست في الاسلام ، فانها اصل من اصول التشريع الاسلامی نعم ان كثيرا

من الاحكام الشرعيه اُسِست على تقاليد كانت جاهلية و اقرها الاسلام لا منها لا تزال وفق بئيته فاذا تغيرت البيئة لم يحدُ للعمل بهذه الاحاديث محل"۲۴

اسی موضوع پر آگے چل کر اقبالؔ لکھتے ہیں کہ:

"یہی وجہ تھی کہ امام ابوحنیفہؒ نے جو اسلام کی عالمگیر نوعیت کو خوب سمجھ گئے تھے، احادیث سے اِعتنا نہیں کیا۔ انہوں نے اصول استحسان یعنی "فقہی ترجیح" کا اصول قائم کیا جس کا تقاضا یہ ہے کہ قانونی غور وفکر میں ہم ان احوال وظروف کا بھی جو واقعتاً موجود ہیں باحتیاط مطالعہ کریں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فقہ اسلامی کے مآخذ کے بارے میں اُن کا رویہ کیا تھا"۲۵

احمد امین نے اس مسئلہ پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

"وربما كان هو الداعى ايضاً الى تخريج الامام ابى حنيفة من الاحاديث والعمل بها واقتصاره على نحو سبعة عشر حديثاً. وانما اعتمد الثرها اعتمد على الاستحسان"۲۶

اسلامی قانون کے تیسرے ماخذ "اجماع" پر اقبالؔ کا خیال یہ ہے:

"میرے نزدیک یہ اسلام کے قانونی تصورات میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ بلاد اسلامیہ میں جمہوری نشوونما اور قانون ساز مجالس کا بتدریج قیام ایک بڑا ترقی زا اقدام ہے"۲۷

جب ہم اس عبارت کا مقابلہ احمد امین کی ''یوم الاسلام'' کے ایک اقتباس سے کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ احمد امین نے اس اقتباس کا ترجمہ کردیا ہے۔ اُن کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''واما الاجماع فهو مبدأ هام من مبادی التشریع الاسلامی و ربما طبق تطبیقاً و افیافی النظام الشوری عند الامم الحدیثة اذ تنتخب أظهر الرجال وأبرزهم''۲۸

اقبالؔ نے سرخسی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

''فقہائے متاخرین کو اجتہاد کے لئے زیادہ آسانیاں حاصل ہیں۔ قرآن مجید اور سنّت رسول ﷺ میں تفاسیر وشروح کا ذخیرہ اس حد تک وسیع ہو چکا ہے کہ آج کل مجتہدین کے پاس بہ نسبت سابق تعبیر وترجمانی کا کہیں زیادہ سامان موجود ہے''۲۹

انہی خیالات میں تھوڑا سا اضافہ کر کے احمد امین نے لکھا ہے:

''والاجتهاد فی عصرنا اسهل من الاجتهاد فی عصرهم،فالمطابع نشرت عشرات التفسیرات القرآن الکریم، و عشرات الکتب فی جمع الحدیث و أصبحت المطالعة فی الکتاب تغنی عن الرحلات المختلفة الی مصر والاندلس و الحجاز، فقد کفانا المحدثون مئونة ذالک''۳۰

ان تمام اقتباسات کے تقابلی مطالعہ سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ احمد امین نے اقبالؔ سے خاصا اخذ و استفادہ کیا ہے اور اپنے اہم تصورات کی بنیاد افکارِ اقبالؔ پر رکھی ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ ہم احمد امین کے فرزند کے اس خیال سے متفق ہوں کہ احمد امین نے اقبالؔ سے کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا ہے۔[۳۱]

حوالے

۱) ظہور احمد اظہر: اقبالؔ کا پہلا عرب مترجم: ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، مقالہ درسہ ماہی 'اقبالؔ' پاکستان، اپریل ۱۹۷۰ء، ص ۵۹

۲) ایضاً، ص ۷۰

۳) اقبالؔ (م۔ن): بحوالہ کتابیاتِ اقبالؔ، از رفیع الدین ہاشمی، اقبال اکادمی، لاہور، پاکستان ۱۹۷۷ء

۴) بحوالہ الاستاذ انور الجندی درمقالہ 'ماذا قدم اقبالؔ لحرکۃ الیقظۃ الاسلامیۃ المعاصر' 'البعث الاسلامی' لکھنو رمضان ۱۴۰۶ھ ص ۸۳

۵) کتابیات اقبالؔ، ص ۱۹۱

۶) ڈاکٹر نجیب الکیلانی: اقبالؔ، الشاعر الثائر، الدار العلمیۃ، بیروت ۱۹۰۹

۷) احمد امین: فیض الخاطر، جلد ۱، ص ص ۳۰۔۳۲

۸) احمد امین: فیض الخاطر، جلد ۱، ص ص ۳۳۔۳۴

۹) ڈیلٹیو خالد: مقالہ ''احمد امین اینڈ محمد اقبالؔ'' در رسالہ 'اقبالؔ ریویو' پاکستان، اپریل ۱۹۷۱ء، ص ۴۴

۱۰) السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی، دمشق ۱۹۴۴ء ص ۱۷۶

۱۱) ولیم شیفرڈ: ''دی فیتھ آف اے ماڈرن مسلم انٹلیکچول'' وکاس پبلشنگ ہاوس، نئی دہلی ۱۹۸۶ء ص ص ۲۰۹۔۲۱۰

۱۲) ظہر الاسلام، ج ۲ قاہرہ ۱۹۴۶ء (بحوالہ) یوم الاسلام، ص ۸۹

۱۲) (۱) یوم الاسلام، ص ۸۹

۱۳) یوم الاسلام، ص ۸۹

۱۴) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ سید نزیر نیازی، ہندوستانی رِپرنٹ، دہلی ۱۹۸۶ء، ص ۱۹۸

۱۵) یوم الاسلام، ص ص ۸۹_۹۰

۱۶) تشکیل جدید، ص ۲۲۹

۱۷) یوم الاسلام، ص ۱۸۹

۱۸) تشکیل جدید، ص ۲۳۰

۱۹) تشکیل جدید، ص ۲۳۱

۲۰) یوم الاسلام، ص ۱۹۰

۲۱) تشکیل جدید، ص ۹۳۲

۲۲) یوم الاسلام، ص ۱۹۰

۲۳) تشکیل جدید، ص ص ۲۶۳_۲۶۶

۲۴) یوم الاسلام، ص ۱۹۶

۲۵) تشکیل جدید، ص ۲۶۶

۲۶) یوم الاسلام، ص ۱۹۶

۲۷) تشکیل جدید، ص ۲۶۷_۲۶۸

۲۸) یوم الاسلام، ص ۱۹۷

۲۹) تشکیل جدید، ص ص ۲۷۴_۲۷۵

۳۰) یوم الاسلام، ص ۱۹۱

۳۱) ولیم شیفرڈ: ''دی فیتھ آف اے ماڈرن مسلم انٹلیکچول'' وکاس پبلشنگ ہاوس، نئی دہلی ۱۹۸۶ء ص ۲۱۳

کلام اقبالؔ کے عربی تراجم وشروح

شاعر مشرق علامہ اقبالؔ اپنے فکر وفن، اسلامیت وانقلابیت عظمت و رفعت خیال، نظریہ خودی اور آفاقیت کی بنا پر دنیا کے اہل علم ودانش، سخن سنجوں اور مفکرین وشعرا کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسوقت کلامِ اقبالؔ کے تراجم پچیس سے زیادہ زبانوں۔ اُردو، اطالوی، انڈونیشی، انگریزی، بنگالی، سندھی، پشتو، پنجابی، تُرکی، جرمن، چیک، سُویڈش، عربی، فارسی، فرانسیسی، گجراتی، سنسکرت، ازبک، تاجک اور کشمیری میں شائقین اقبالؔ کے سامنے موجود ہیں۔

فارسی اور اردو شعراء میں اقبالؔ سب سے زیادہ خوش نصیب ہیں کہ عرب دنیا نہ صرف ان کی زندگی کے حالات اور فلسفہ وشاعری سے پوری طرح متعارف وآگاہ ھے بلکہ اُن کے تقریباً تمام شعری مجموعے عربی اشعار کے قالب میں ڈھل کر بلادِ عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ چُکے ہیں اور آج عربی ادب میں کئی ایک ایسے شعراء اور ادباء ہیں جن کے ہاں کلام اقبالؔ کی روح موجزن نظر آتی ہے۔[1]

ذیل میں ہم کلام اقبالؔ کے عربی تراجم اور اُن کی حیات اور فکر وفن پر لکھی گئی تصنیفات کی ایک مختصر فہرست پیش کررہے ہیں۔ یہ فہرست کسی طرح بھی مکمل

نہیں کہی جاسکتی کیونکہ عالم عربی میں اقبالؔ پر شائع ہورہی کتابوں کا ہمیں یہاں کشمیر میں پورا علم نہیں ہو پاتا ہے اور نہ آسانی سے فراہم ہو پاتی ہیں۔ البتہ بعض تصنیفات اور پاکستانی کُتب و جرایدوغیرہ کے مطالعہ سے جو معلومات فراہم ہوسکی ہیں ان کو قارئین کے سامنے پیش کررہے ہیں۔

ا۔ ڈاکٹر عبدالوھاب عزام:

رسالة المشرق منظوم عربی ترجمه پیام مشرق

یہ ترجمہ ۱۹۸۱ء میں مجلس اقبال کراچی سے شائع ہوا ہے۔ اپنے مقدمہ میں ڈاکٹر عزام نے اقبالؔ سے اپنے تعلق اور مصر میں اُن کے ساتھ ملاقات، مصر اور دیگر ممالک میں وفات اقبالؔ کے سلسلہ میں منعقدہ تعزیتی مجالس میں اپنی تقاریر اور ۱۹۴۷ء میں علی اصغر حکمت کے ساتھ مَرقد اقبالؔ پر حاضری کی تفصیلات دی ہیں۔ اس کے علاوہ سیرت اقبالؔ، انکی تصانیف اور فکر وفن پر بھی اختصار کے ساتھ بات کی ہے۔

پیام مشرق، کا حصہ اول رباعیات پر مشتمل ہے جنکی تعداد ۱۶۳ ہے عزام نے ان کا ترجمہ ''شقایق الطّور'' کے عنوان کے تحت کیا ہے

حصہ دوم ''افکار'' سے موسوم ہے اسمیں ۵۳ نظمیں ہیں، عزام نے صرف چالیس نظموں کا ترجمہ ''افکار'' ہی کے عنوان سے کیا ہے

حصہ سوم میں ''مئے باقی'' کے زیر عنوان ۴۵ غزلیں موجود ہیں۔ عزام نے

''الخمر الباقية'' کے عنوان کے تحت ۲۴ غزلوں کا ترجمہ دیا ہے۔

حصہ چہارم ''نقش افرنگ'' میں مختلف عنوانات کے تحت ۳۶ منظومے ہیں، ان میں سے ''نقش الا فرنج،، کے تحت صرف ۱۹ کا ترجمہ کیا گیا ہے ''خردہ'' کے زیر عنوان سولہ اشعار ''پیام مشرق'' میں موجود ہیں عزام نے ''رقایق'' کے تحت صرف ۹ کا ترجمہ کیا ہے۔

آخر میں عزام نے ''اَللّمعَات'' کے عنوان کے تحت کئی منظومات کو عظمت اقبالؔ کے احترام واعتراف کے طور پر شامل اشاعت کیا ہے۔

۲۔عبدالوهاب عزام:

''ضرب الكليم''، منظوم عربی ترجمہ ''ضرب کلیم'' القاہرہ ۱۹۵۲ء

۳۔عبدالوهاب عزام

ديوان الا سرار والرَّموُز منظوم عربی ترجمہ ''دیوان اسرار خودی ورموزبے خودی'' قاہرہ، مصر، ۱۹۵۶، طباعت ثانی قاہرہ ۱۹۸۱ء۔

۴۔حسين مجيب المصری:

''الى السماء''، منظوم عربی ترجمہ ''جاوید نامہ'' قاہرہ، ۱۹۷۳ء

۵۔حسين مجيب المصری:

هَدِيَّة الِحجاز منظوم ترجمہ معہ تشریح وتعارف ارمغانِ حجاز حصہ فارسی، قاہرہ ۱۹۷۵ء

۶۔حسین مجیب المصری:

''زبورِ العجم''۔منظوم ترجمہ زبورِ عجم

۷۔شیخ صاوی شعلان:

مُختارات مِن شعر اقبالؔ مع الترجمة العربیه ''ادارۂ تحقیقات اسلامیہ، اسلام آباد پاکستان ۱۹۷۴ء (لینن خدا کے حضور میں، فاطمہ بنت عبداللہ اور حضور رسالت مآب ﷺ کا اردو متن)

۸۔شیخ صاوی شعلان:

''طلوع اسلام'' (بانگ درا کی نظم طلوع اسلام کا منظوم ترجمہ سفارت خانہ پاکستان

۹۔شیخ صاوی شعلان:

''ایوان اقبال'' شیخ صاوی شعلان گذشتہ چار پانچ دہائیوں سے جو تراجم کرتے آئے ہیں ان تمام کا مجموعہ ''ایوان اقبال'' کے عنوان سے اگست ۱۹۷۷ء میں پہلی بار شائع ہوا ہے

۱۰۔شیخ صاوی شعلان:

'روضة الاسرار ''ترجمہ گلشن راز جدید'

۱۱۔صاوی شعلان/محمد حسن الا عظمی:

''حدیث الروح ''(شکوہ وجواب شکوہ کا منظوم ترجمہ) قاہرہ

(س-ن) بیروت ۱۹۷۳ء

۱۲۔ محمد حسن اعظمی/محمد علی صغیر/صاوی شعلان:

''الانشودة الاسلامية'' لا ستاذ العلامةالدكتور اقبال لاهوری، حسینیہ ارشاد، تہران

۱۹۶۸ء منتخب کلام، عربی نثری ترجمہ از محمد حسن اعظمی، منظوم عربی ترجمہ: صاوی شعلان، فارسی ترجمہ: محمد علی صغیر

۱۳۔ محمد حسن اعظمی/صاوی شعلان:

''الحياة والموت فی فلسفة اقبال''، مرکزی بزم اقبال حیدر آباد، دکن، ۱۹۴۵ء، کراچی، ۱۹۴۹ء۔

۱۴۔ الدکتور سمیر عبدالحمید ابراهيم:

ديوان الاسرار و الرموز، درسه وحققه، وأكمل ترجمته نثراً، مکتبہ علمیہ لاہور ۱۹۷۸ء، دار الانصار، قاہرہ ۱۹۸۱ء۔

یہ تحقیقی کام قاہرہ یونیورسٹی کے اردو کے پروفیسر عبدالحمید ابراہیم کا ہے۔ یہ اصل میں عبدالوہاب عزام کے ترجمہ ''اسرار خودی ورموز بے خودی'' ''الاسرار والرموز'' کا تنقیدی مطالعہ ہے۔ پروفیسر موصوف کا کہنا ہے کہ جب میں نے عزام کے منظوم ترجمہ کا اصل سے موازنہ کیا تو میں نے پایا کہ عزام نے تقریباً ۱۵۰

اشعار کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے۔

ترجمہ کی ابتداء میں ڈاکٹر سمیر نے ''نظرۃ تاریخیۃ'' کے تحت اس زمانے کے حالات کا ایک جائزہ پیش کیا ہے جس زمانے میں ''اسرار خودی'' لکھی گئی تھی۔ مصنف کے خیال میں اقبالؔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۳ء تک ایک زبردست داخلی اور ذہنی اضطراب کے دور سے گذر رہے تھے۔ مطالعہ قرآن کریم کے بعد اُن پر یہ بات منکشف ہوگئی کہ قرآن تو عمل صالح اور جہاد انفس و آفاق کی تعلیم دیتا ہے یہ نہ صرف اُخروی نجات کی راہ روشن کرتا ہے بلکہ دنیوی زندگی میں بھی رفعت و سربلندی کے راستے بھی منور کرتا ہے۔ جب یہ بات ہے تو مسلماں قوت عمل سے محروم کیوں ہیں؟ اس بات پر اقبالؔ نے جب غور کیا تو انہیں محسوس ہوا کہ غیر اسلامی تصوف یعنی فلسفہ وحدت الوجود نے مسلمانوں سے ذوق عمل سلب کرلیا ہے۔

مصنف نے ''اسرار خودی'' ہر صوفیہ کی طرف سے ہوئے اعتراضات کا بھی جائزہ لیا ہے اس سلسلہ میں خواجہ حسن نظامی، پیرزادہ مظفر احمد فضلی اور اکبرالہٰ آبادی کی مخالفت پر بھی گفتگو کی ہے۔ حسن نظامی اکبرالہٰ آبادی اور اقبالؔ کے درمیان ہوئی مراسلت کے اقتباسات بھی پیش کئے ہیں۔ جہاں اقبالؔ نے اپنی پوزیشن واضح کی ہے۔

پروفیسر نکلسن کے نام اقبالؔ کے ایک طویل خط کے اقتباسات کا بھی

ترجمہ دیا گیا ہے جس میں اقبالؔ نے مغربی ناقدین کی سُوءِ فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے یاد رہے کہ پروفیسر نکلسن نے اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ Secrets of the Self کا زیرِعنوان ۱۹۲۰ء میں شائع کیا تھا۔

مصنف کتاب جناب عبدالحمید ابراہیم نے ''اسرار خودی'' کی قرآنی اساس پر بھی بحث کی ہے۔

''اسرار خودی'' اور ''رموز بے خودی'' کے مختلف زبانوں میں ہوئے تراجم اور مطالعات کی بھی تفصیل پیش کی ہے۔

آخر پر مصنف نے عزام کے اغلاط کی تصحیح کی ہے اور جن اشعار کو عزام نے ترجمہ کے بغیر چھوڑا تھا مثلاً شرح اسماء علی مرتضیٰؓ اور ''درمعنی حریت اسلامیه و سرِ حادثه کر بلا'' کے تحت آنے والے اشعار وغیرہ کا نثری ترجمہ پیش کیا ہے۔

۱۵۔ الاستاذ سمیر عبدالحمید ابراهیم:

اقبال و دیوان ارمغان حجاز. عصره، فکره، أدَبه، ترجمة وتحلیل الدیوان '' مکتبہ علمیہ لاہور، پاکستان۔ ۱۹۷۶ء

زیرِنظر کتاب میں نہ صرف ''ارمغان حجاز'' اردو فارسی کا مکمل نثری عربی ترجمہ ہے بلکہ اُس عہد کے سیاسی، سماجی، مذہبی وغیرہ حالات کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے جس عہد میں علامہ اقبالؔ جی رہے تھے۔ مصنف نے

''اقبال المفکر'' کے زیر عنوان ثقافت اقبال ان کی فکر اسلامی، فلسفہ خودی، نظریہ انسان کامل، فکر اقبال کے مشرقی و مغربی مصادر پر گفتگو کی ہے۔ مشرقی مصادر میں قرآن حکیم رسول کریم ﷺ، رومی، اور جیلی کا حوالہ دیا ہے۔ اور مغربی مصادر میں فلسفہ یونان، گویٹے، نٹشے، برگسان اور فشٹے پر مُفصل بحث کی ہے ''اقبال الأدیب'' کے عنوان کے تحت ''اسرا خودی'' ''رموز بے خودی'' ''پیام مشرق'' ''بانگ درا''، ''زبور، عجم'' ''جاوید نامہ''، ''مسافر''، ''بال جبریل''، ''پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق''، ''ضرب کلیم''، ''ارمغان حجاز'' پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

''ادب اقبال'' کے باب میں اقبال کے نزدیک فن شاعری، اقبال کے موضوعات شعری، اقبال کا ادبی مذہب، شعر اقبال کا پیغام، ادب اقبال پر ادب عربی کے اثرات اور ابتکارات اقبال پر بحث ہے۔ اقبال کے شاعری میں جدت خیال، منظر نگاری اور فصاحت و بلاغت پر بات کی گئی ہے اس کے علاوہ ان تمام اقسام شاعری پر بھی ایک مُفید بحث ہے جن میں اقبال نے طبع آزمائی کی ہے مثلاً غزل، مثنوی، ہجو۔ نظم مرثیہ، رباعیات وغیرہ۔

۱۶۔ ڈاکٹر محمد السعید جمال الدین:

رسالة الخلود (نثری ترجمہ جاوید نامہ) قاہرہ ۱۹۷۴ء عربی نثر میں یہ ''جاوید نامہ'' کا ترجمہ ہے۔ دراصل یہ مترجم کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے جو انہوں نے عین شمس یونیورسٹی قاہرہ میں پیش کیا اور ڈگری لی۔ یہ کتاب چار سو

صفحات پر مشتمل ہے جسمیں چوون صفحات پر مشتمل فاضلانہ اور معلومات افزامقدمہ بھی ہے ۲؎

۱۷۔ عبدالماجدالغوری حیدر آبادی:

''دیوان محمد اقبالؔ. الاعمال الکاملة'': ۲۰۰۳ء میں ایم۔آئی۔آئی فاونڈیشن حیدرآباد بھارت اور دارابن کثیر، دمشق و بیروت کے اشتراک سے اردوو فارسی دواوینِ اقبالؔ کا عربی منظوم ترجمہ پہلی بار دوجلدوں میں یکجا کر کے شائع کیا گیا ہے۔ ترتیب کار عبدالماجد الغوری حیدرآبادی نے مقدمہ کے علاوہ حیات اقبالؔ، شخصیت اور فکروفلسفہ اورادبی خدمات پر ایک مبسوط مقالہ لکھا ہے۔

اسکے علاوہ ہر دیوان پر مختصر مقدمہ بھی لکھا ہے۔ اور تعلیقات لکھ کر اس اشاعت کی افادیت میں خاصا اضافہ کردیا ہے۔ ترتیب یوں ہے۔

جلداول

۱۔ بانگ درا

۲۔ اسرار خودی و رموزِ بے خودی

۳۔ پیام مشرق

۴۔ زبور عجم

۵۔ بال جبریل

جلد دوم

۶۔ ضرب کلیم

۷۔ جاوید نامہ

۸۔ پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق

۹۔ ارمغان حجاز (حصہ فارسی)

دیوان میں شامل تراجم کوئی نئے تراجم نہیں ہیں بلکہ پہلے سے موجود پروفیسر عزام، شیخ صاوی شعلان، پروفیسر حسین مُجیب مصری اور دیگر حضرات کے تراجم کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

مرتب عبدالماجد غوری نے ''صلصلۃُ الجرس'' کے عنوان کے تحت ''بانگ درا'' کی دو مشہور نظموں ''ترانہ ملی'' اور ''شکوہ و جواب شکوہ'' کا ترجمہ دیا ہے جو مصر کے نابینا شاعر و ادیب شیخ صاوی شعلان کی کاوشِ قلم کا نتیجہ ہے۔

''رسالۃ الشرق'' کے تحت ''پیام مشرق'' کا پروفیسر عزام کا ترجمہ شامل ہے مگر اسمیں انتخاب سے کام لیا گیا ہے۔

''زبورُ العجم'' عنوان کے تحت ''زبور عجم'' میں شامل ''گلشن راز جدید'' کا ترجمہ دیا گیا ہے جس کے مترجم پروفیسر حسین مُجیب مصری ہیں۔

''جَناحُ جبریل'' بالِ جبریل کا ترجمہ ہے۔ بالِ جبریل کا پہلے

فرانسیسی نثر میں میرزا سعید ظفر شاغتی اور محترمہ سُوزان بوساک نے ترجمہ کیا۔ فرانسیسی سے اس کو پروفیسر عبدالمعین ملوحی نے عربی نثر میں منتقل کیا۔ اس کے بعد پروفیسر زھیر ظاظا نے عربی نظم کا جامہ پہنایا۔ ظاہر ہے کہ ترجمہ در ترجمہ سے اس کی شعریت پر اثر پڑا ہے۔

''ضرب الکلیم'' کے عنوان کے تحت ظاہر ہے کہ ''ضرب کلیم'' کا ترجمہ دیا گیا ہے جو پروفیسر عزام نے ۱۹۵۲ء میں شائع کیا تھا۔

''رسالة الخلود'' کے عنوان سے پروفیسر حسین مُجیب مصری کا کیا ہوا ''جاوید نامہ'' کا ترجمہ شامل ہے۔

''والآن ماذا نصنع؟ یا أمَمَ الشرق'' پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' کا ترجمہ ہے۔ اس دیوان کو پہلے پروفیسر احمد الغازی نے عربی نثر میں منتقل کیا اسکے بعد شیخ صاوی شعلان نے اسکو عربی اشعار کے قالب میں ڈھالا۔

''ھدیة الحجاز'' ارمغان حجاز (حصہ فارسی) کا ترجمہ ہے ترجمہ کار پروفیسر حسین مجیب مصری ہیں۔ یاد رہے کہ ارمغان حجاز اردو فارسی کا عربی نثر میں پروفیسر سمیر عبدالحمید ابراھیم نے ترجمہ کیا ہے جو علاحدہ کتابی شکل میں شائع ہوا ہے۔

۱۸۔عباس محمود

تجدید التفکیر الدینی فی الاسلام ۔یہ اقبالؔ کی انگریزی کتاب Reconstruction of Religious Thought in Islam. کا ترجمہ ہے جو ۱۹۵۵ء میں لجنة التالیف والترجمه والنشر، قاہرہ سے شائع ہوا ہے۔

اقبالؔ پر عربی تصنیفات کا ایک تعارف

۱۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام: ''محمد اقبالؔ : سیریه و فلسفته وشعره''

مصر کے مایہ ناز ادیب وشاعر، صوفی منش، فلسفی اور سفارت کار پروفیسر عبدالوہاب عزام (۱۸۹۴۔۱۹۵۹ء) کا شمار عاشقانِ اقبالؔ کے صف اول میں ہوتا ہے دنیائے عربی میں اقبالؔ کا پیغام پہنچانے اور اسکو عام کرنے اور اُنکے کلام کا ترجمہ کرنے کا سہرا اولاً عزام ہی کے سر جاتا ہے۔ زیر تعارف کتاب اُسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب اقبالؔ اکادمی پاکستان سے ۱۹۵۴ءمیں پہلی دفعہ شائع ہوئی اسکے بعد اسکی دوسری اور تیسری طباعتیں ۱۹۶۰ء اور ۱۹۸۵ء میں پاکستان سے ہی شائع ہوئیں۔ اس کا ایک ایڈیشن الدار العلمیہ، بیروت سے بھی ۱۹۷۲ء میں منظر عام پر آیا۔

کتاب کے مقدمے نامور مصری اہل قلم وفکر ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور ڈاکٹر یحییٰ الخشاب نے تحریر کئے ہیں۔ پروفیسر عزام نے اپنے پیش لفظ میں بتایا ہے کہ وہ کیسے ترکی کے شاعر اسلام عاصف بک کے ذریعہ علامہ اقبالؔ سے متعارف

ہوئے عاصف بک اور عزام ان دنوں قاہرہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ عاصف بک ہی نے عزام کو اقبالؔ کی ''پیام مشرق'' ہدیہ کی۔ یہ دونوں حضرات اقبالؔ کے اشعار کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔

اس کے بعد عزام لکھتے ہیں کہ جب میرے دوست واحباب کو میری اقبالؔ سے دلچسپی کا علم ہوا وہ اقبالؔ کی تصنیفات میرے پاس بھیجتے رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اسرار خودی'' اور ''رموز بے خودی'' کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اقبالؔ کے فلسفۂ خودی سے آگاہ ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ میرے دل میں اقبالؔ کے لئے محبت واحترام فروغ پاتا گیا۔ ازاں بعد عزام نے مصری مجلّات الرسالہ اور الثقافۃ میں اقبالؔ کے پیغام پر مقالات کا سلسلہ شروع کیا۔

عزام نے یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۹۳۱ء میں مسجد الاقصیٰ میں منعقد ہونے والی مؤتمر اسلامی میں شرکت کے لئے اقبالؔ مصر بھی تشریف لے گئے تھے۔ نوجوانوں کی اسلامی تنظیم جمعیت الشبان المسلمین نے ان کے اعزاز میں ایک جلسہ کا بھی اہتمام کیا۔ اس جلسہ میں اقبالؔ نے انگریزی میں تقریر کی جسکا ترجمہ پروفیسر محمد الغمراوی نے معاً بعد کیا۔ خود پروفیسر عزام نے اقبالؔ کے فکر وفن پر ایک تقریر کی۔

۱۹۳۷ء میں اقبالؔ کے انتقال پُر ملال پر مصر اور دیگر ممالک میں جو تعزیتی

مجالس منعقد ہوئیں ان میں پروفیسر موصوف کو خصوصی طور پر اظہار خیال کے لئے بلایا جاتا تھا۔

عزام کے مقدمہ کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۹۴۷ء میں علی اصغر حکمت کے ہمراہ مزارِ اقبالؔ پر حاضر ہوئے تھے اور وہاں منعقدہ ایک جلسہ میں اپنے تاثرات کا اظہار بھی کیا تھا۔ وہ دِلّی سے سنگ مرمر کی سِل پر اقبالؔ پر اپنے کچھ اشعار بھی کندہ کرا کے لائے تھے اور ناظمین سے درخواست کی تھی کہ وہ مرقد اقبالؔ پر نصب کریں۔ اس کے بعد وہ جاوید منزل بھی گئے تھے اور اقبالؔ کے صاحبزادے جاوید اقبالؔ اور خادم علی بخش سے بھی ملاقات کی تھی۔

زیر تعارف کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں مصنف نے اقبالؔ کی ولادت سے لیکر اُن کے خاندان، لاہور میں مُنشقلی، تعلیم و تربیت ،سفر یورپ سفر اور یورپ سے مراجعت کے بعد اقبالؔ کی سرگرمیوں پر تفصیلات فراہم کی ہیں۔ باب دوم میں اقبالؔ کے فلسفہ خودی پر ''اسرار خودی'' اور ''رموز بے خودی'' کی روشنی میں بحث کی ہے اور یورپین مقرضین کے اعتراضات پر اقبالؔ کے جواب پر گفتگو کی ہے۔

باب سوم میں اقبالؔ کی شاعری پر بحث ہے۔ اس میں انہوں نے دواوین اقبالؔ، فنون لطیفہ میں اقبالؔ کا موقف، شاعری کے بارے میں اقبالؔ کے نقطہ نظر پر بحث کی ہے اور کلام اقبالؔ سے استشہاد کر کے اپنی بحث کو مؤثر بنا دیا

ہے۔ کتاب اپنے مختصر حجم کے باوجود اقبالؔ سے متعلق اہم مباحث کو حُسن وخوبی سمیٹتی ہے۔

۲۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ: ''روائع اقبالؔ''

یہ کتاب بین الاقوامی شہرت کے عالم دین، نامور مؤرخ اور عربی واردو کے مایہ ناز انشاپرداز مرحوم مولانا ابوالحسن علی ندوی کی معروف ومقبول تصنیف ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۰ء میں دمشق سے شائع ہوا۔ اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن مختلف مقامات سے منظر عام پر آئے۔ متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کی وجہ تصنیف خود مولانا کے الفاظ میں یہ تھی کہ ''ہمیں یہ بات کھٹکتی تھی کہ طیگور، اقبالؔ کے مقابلے میں بلادِ عربیہ میں زیادہ روشناسِ ہیں اور مصر وشام کے عرب ادیب ان کے عام طور پر گرویدہ ہیں۔ ہم اس صورت حال کو اپنی ہی کوتاہی کا نتیجہ سمجھتے تھے کہ ہم نے اقبالؔ کو متعارف نہیں کرایا۔ عربی کے مجلّات میں ٹیگور وغیرہ پر جب کبھی ہم تعریفی مقالات دیکھتے تو اقبالؔ کے عربی ترجمہ کا عزم تازہ ہو جاتا اور اسے اپنے ذمہ قرض وامانت سمجھنے لگتے'' اسی دوران پروفیسر عزام کے ترجمے آنا شروع ہو گئے مگر منظوم ترجمے سے کلام اقبالؔ کی اصل روح عرب قارئین تک پوری طرح نہیں پہنچ پاتی تھی۔ اس لئے دمشق کے مؤقر جریدہ ''المسلمون'' میں عربی کے مشہور ادیب علی طنطاوی نے مولانا کے نام ایک کھُلے خط میں لکھا تھا: ''کیا آپ شعر اقبالؔ کے منتخب حصے کا

ترجمہ کرکے ہمیں اقبالؔ اور ان کے فکر و عقیدہ کی عظمت کو سمجھنے اور اس کا راز معلوم کرنے کا موقع فراہم کرینگے اس لئے کہ ان کے عربی ترجمے ہمارے درمیان سے اجنبیت کی دیوار کو پوری طرح نہیں ڈھا سکے ہیں۔ کیا آپ اس جلیلِ القدر خدمت کو اپنی خدمات میں شامل کرینگے اور اس نظروں سے اوجھل چمن زار کی سیر کا موقع دینگے یا ہدیۂ شمیم و نکہت بھیجکر اس گلستان سے محروم لوگوں کو نوازینگے'' ۳۲

اس خط کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور ''روائع اقبالؔ'' منصۂ شہود پر آ گئی۔ اس کتاب کے اہم مباحث یہ ہیں:

شاعر اسلام۔ حیات و خدمات۔ اقبال کی شخصیت کے تخلیقی عناصر۔ اقبالؔ اور مغربی تہذیب و ثقافت مغربی تہذیب اور مسلم ممالک۔ اقبالؔ اور عصری نظام تعلیم۔ اقبالؔ کا نظریہ علم و فن۔ اقبالؔ اور فنون لطیفہ۔ انسانِ کامل اقبالؔ کی نگاہ میں۔ مرد مومن کا مقام۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ۔ اقبالؔ کا پیغام بلاد عربیہ کے نام۔ مسجد قرطبہ۔ ذوق و شوق۔ اقبالؔ اور مسئلہ فلسطین۔ طارق کی دعا۔ ساقی نامہ۔ ابوجہل کی نوحہ گری۔ ایک لمحہ جمال الدین افغانی کے ساتھ۔ اقبالؔ در دولت پر۔ شکوہ و مناجات۔

مرحوم معین الدین احمد ندوی نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولانا نے اقبالؔ کی اہم نظموں اور متفرق اشعار سے اسلام کی بنیادی تعلیمات، ان کی روح اور ملت اسلامیہ کی تجدید و اصلاح، مغربی تہذیب اور اسکے

علوم وغیرہ کے متعلق اقبالؔ کے افکار وخیالات کا خلاصہ اور لُب لُباب پیش کر دیا ہے جس سے اس کے اہم رُخ سامنے آئے ہیں اگر چہ یہ کتاب مختصر ہے لیکن اقبالؔ کے مقصد، پیغام اور افکار وتصورات کو سمجھنے کے لئے بالکل کافی ہے۔[۴]

۳۔ ڈاکٹر نجیب ا گیلانی: اقبالؔ. الشاعر الشایر .(اقبالؔ ایک انقلابی شاعر)

یہ کتاب مصر کے نامور ادیب، شاعر، نقاد، ڈرامانگار اور معالج ڈاکٹر نجیب گیلانی (۱۹۳۱۔ ۱۹۹۵ء) کی کاوش قلم کا نتیجہ ہے۔ موصوف زمانہ طالب علمی سے ہی معروف اسلامی تنظیم اخوان المسلمون سے وابستہ تھے جسکی پاداش میں انہیں سالوں سال قید و بند کا شکار ہونا پڑا۔ پھر بھی اپنی خداداد استعداد کے بوتے پر اسنی سے زیادہ تصنیفات کے خالق بنے۔ زیر تعارف کتاب زِندان میں ہی رقم کی گئی ہے اور اسے کئی انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔ یہ کتاب مولانا علی مَیاں کی ''روائع اقبالؔ'' کے بعد عربی میں بہترین کتاب مانی جاتی ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں ''مصنف لکھتے ہیں کہ میں یہ سطور مملکت خُداداد پاکستان کے داعی اول اقبالؔ کے بارے میں لکھ رہا ہوں کیونکہ ان کا فلسفہ، ان کی شاعری اور نظریات باطلہ کے خلاف ان کی فکری جنگ اس قابل ہے کہ ہمارے نوجوانان قوم اسکا مطالعہ کریں اور انہی افکار کی روشنی میں اپنے مستقبل کا تعین کریں اور طاقت ور استعماری قوتوں کے خلاف معرکہ میں ان کو زادِراہ بنائیں۔

مصنف کا خیال ہے کہ اقبالؔ ان معدودے چند شخصیات میں سے تھے جنہوں نے آسمان مشرق کو مُنوّر کر دیا۔

کتاب میں اقبالؔ کی سیرت اور تعلیم و تربیت کے علاوہ متعدد موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے جس میں سے بعض یہ ہیں۔

اقبالؔ اور فن۔ فلسفہ خودی۔ اقبالؔ اور شاعری۔ شعر اقبالؔ میں حُرّیت۔ اقبالؔ تقلید و تجدید کے درمیان۔ کلام اقبالؔ میں فطرت نگاری۔ اقبال اور عورت۔ اقبالؔ اور ابوالعلا المعری۔ قلندری۔

فقر کتاب کی تیسری طباعت بیروت لبنان سے ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی ہے۔

۴۔ **ڈاکٹر خلیل الرحمان عبدالرحمان راز: ''محمد اقبالؔ و موقفه من الحضارة الغربية**

سعودی عرب میں قدامت پسند عُلماء کے اثرات وسیع اور گہرے ہیں۔ انہی اثرات کے تحت علامہ اقبالؔ کے فلسفیانہ افکار اور خطبات اقبالؔ کے حوالے سے کچھ شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں۔ تاہم سعودی عرب کی اُم القُریٰ یونیورسٹی مکہ میں کچھ عرصہ قبل ''علامہ اقبالؔ اور مغربی تہذیب کے بارے میں ان کا نقطہ نظر'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا ایک مقالہ تحریر کیا گیا ہے مقالہ نگار جناب خلیل الرحمان کا تعلق بھارت سے ہے اور نگران مقالہ معروف مصری اسکالر اور سید

قطب شہید کے بھائی جناب محمد قطب تھے۵۔ اسی مقالہ کی نوک پلک درست کر کے ۱۹۸۶ء میں دارِ حراء مکتہ المکرّمہ سے شائع کیا گیا ہے۔

مقدمہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ امت مسلمہ پچھلی تین صدیوں سے مغرب کی سیاسی، عسکری، اقتصادی، فکری اور تہذیبی یلغار سے مغلوب ہوگئی ہے۔ امت مسلمہ میں موت کا خوف طاری ہوگیا ہے اور اس کا ذہن فکری، عسکری اور سائنسی علوم میں سرگرمیوں کے حوالہ سے صدیوں سے ماؤف ہوگیا ہے۔ اسوجہ سے مغربی دنیا مسلمانوں کے بڑے بڑے مناطق پر مسلط ہوسکی۔ وہ مغرب کے مکر و فریب کی شکار ہوگئی اور آلات حرب وضرب اور عسکری اسٹریٹجی Strategy سے خائف ہوگئی۔ مغربی سیاست اور اقتصادی قوتوں کے سامنے ہتھیار ڈالدئے۔ مغرب نے جاری قوت کے بل بوتے پر فرد اور سماج کے لئے ایک ایسا نظم پیدا کردیا جو دین واخلاق کے لئے سب سے زیادہ مُہلک ثابت ہوا۔

امت مسلمہ کو خوف، جہالت اور جمود نے اس حد تک دبوچ لیا تھا کہ جوانانِ مسلم اپنے مذہبی اور رُوحانی اقدار سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ مسلمانوں میں ایک ایسا داعی پیدا ہو جو ان میں عقاید دین پھر سے لوٹادے اور دین سے ان کا تمسک قوی کردے۔ ان کے نشاۃ حیات کی تجدید کرے اور اُن کی حیاتِ خفتہ میں حرکت وحرارت پیدا کرے۔ مگر ایسے داعی کے لئے ضروری تھا کہ وہ نہ صرف کتاب وسنت، ائمہ سلف اور اسلامی تاریخ سے کما حقہ

آگاہ ہو بلکہ مغربی علوم و فلسفہ اور اسکے عقاید پر بھی اسکی نگاہ گہری ہو۔ اس میں شک نہیں کہ برصغیر ہندو پاک میں اللہ تعالیٰ نے ایسی صلاحیتں اور استعداد علامہ اقبالؔ میں بدرجہ اتم ودریعت کی تھیں۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں اور فکر وفلسفہ کو بروے کار لا کر امت مسلمہ میں حرکت ولولہ اور تازگی ایمان پیدا کی۔ یہ کتاب مقدمہ اور چار ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول میں اقبالؔ کی حیات اور ادبی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

باب دوم میں اقبالؔ کے فلسفہ اور اعتقادات پر بحث ہے۔

تیسرے باب میں مغربی فکر وتہذیب کے بارے میں اقبالؔ کا نقطہ نظر واضح کیا گیا ہے۔ اس باب کے چار حصے ہیں۔ حصہ اول میں مغربی فکر اور اسکی بنیادوں پر اقبالؔ کی تنقید ہے۔ دوسرے حصہ میں مغربی فکر اور سیاسیات، اقتصادیات اور سوسائٹی پر اس کے رویہ پر تنقید ہے۔ تیسرے حصے میں دین واخلاق اور مغربی فکر کے موضوع پر بحث ہے۔

اور چوتھے حصے میں تعلیم وادب اور فن کے مغربی مناہج پر اقبالؔ کی تنقید سے بحث ہے۔

چوتھے باب میں فکر اقبالؔ کے اثرات امت مسلمہ پر کے عنوان کے تحت گفتگو کی گئی ہے۔ اسے علاوہ بعض مشاہیر اسلام کے بارے میں اقبالؔ کی آراء کو پیش کیا گیا ہے اور اقبالؔ پر بھی کئی اہل علم ودانش کی آراء کو بھی نقل کیا گیا ہے۔

۵۔ ڈاکٹر خلیل الرحمان عبدالرحمان رآز: ''اقبال و قضایا وَ عَاصرہ''

یہ کتا بچہ سعودی عرب میں پاکستانی سفارت خانے نے شائع کیا ہے۔اس میں مغربی تہذیب و فکر خصوصاً اسکے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظریات پر اقبآل کے نقد و انتقاد کو بیان کیا گیا ہے۔اس طرح اشتراکیت اور صیہونیت اور مسئلہ فلسطین کے بارے میں علامہ کے نظریات کی وضاحت کی گئی ہے۔[۶]

۶۔ عبد اللطیف جوھری: ''اقبآل، شاعر الوحدة الا سلامیه''

نیہ ایک تعارفی، معلوماتی اور عمومی نوعیت کی کتاب ہے۔مصری مصنف نے علامہ کے مختصر سوانح بیان کرنے کے بعد افکار اقبآل خصوصاً ان کے تعلیمی نظریات پر اظہار خیال کیا ہے۔''اقبآل والعرب'' کے زیر عنوان مصنف نے عرب قوم پرستی کے نتیجے میں رونما ہونے والی انتہائی تکلیف دہ صورت حال پر تبصرہ کیا ہے۔گہرے دِلی درد و کرب کے ساتھ اقبال سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

''ایُّھَاد السید الھندی !میری قوم نے آپ کی نصیحت پر توجہ نہیں کی اور نہ آپ کی تنبیہ پر غور کیا۔اسکے برعکس وہ ابولہب اور ابوجہل کے راستے پر چل پڑی۔جس کے نتیجے میں اسکی جمعیت پارہ پارہ ہوگئی اور اُن کی اپنی زمین میں گدھیں انہیں نوچنے لگیں''۔

''اقبال اور عالم اسلام'' کے تحت مصر، پاکستان اور فلسطین کے بارے میں اقبال کے خیالات کا ذکر کیا ہے۔ دوسری فصل اقبال کے شاعرانہ اور ادبی مقام پر مختصر اظہار خیال اور اُن کی منتخب شاعری کے تراجم پر مشتمل ہے۔ تیسری فصل میں متعدد عرب مصنفین کے نثری اقتباسات جمع کئے ہیں جسمیں علامہ اقبال کے افکار پر تبصرہ ہے اور انہیں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔[۷] کتاب مکتبہ النور مصر سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی ہے۔

۷۔ محمد اقبال سُہیل: ''اقبال والامۃ الاسلامیہ''

یہ کتابچہ پاکستانی مؤلف کی تحریر ہے۔ اس کے عنوان ''اقبال اور ملت اسلامیہ'' سے موضوع و مبحث کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ مصنف نے پہلے تو مغربی استعمار (بشمول امریکہ، روس اور اسرائیل) کے نفاق، ظلم، مادہ پرستی اور بطور خاص اسلام کے خلاف اسکی رشیہ دوانیوں اور ظالمانہ اور تخریبی کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر عالم اسلام کے مختلف حصوں میں سامراجیت کے مخالفین اور مجاہدین آزادی کا تذکرہ کیا ہے۔ اسکے بعد بتایا ہے کہ ان سب میں اس صدی کے بہت بڑے عبقری اور اسلامی شاعر و فلسفی محمد اقبال نمایاں ہیں۔ جنہوں نے اپنے ایمان، نور بصیرت، گہری نظر اور علمیت کے سبب اسلامی ثقافیت کے امکانات کو واضح کیا ہے۔[۸]

۸۔نداءِ اقبالؔ:

یہ کتاب اقبالؔ کانفرنس دمشق کے مقالات پر مشتمل ہے۔اس کتاب کے بیش تر مقالہ نگاروں کا تعلق شام سے ہے۔مقدمہ پاکستانی سفارت خانے کے جناب توحید احمد کے قلم سے ہے۔جو شام کے اندر اقبالیات کی ترویج وفروغ میں پیش پیش ہیں۔افتتاحی خطبے (سفیر پاکستان جناب ایاز احمد خان) کے علاوہ مجموعے میں نو مقالات اور تین منظومات شامل ہیں۔۹

۹۔ محمد پرویز عبدالرحیم: "اقبالؔ الشاعر الفیلسوف الندرة التی از هرت پاکستان"

دمشق کے پاکستانی سفارت خانے نے اقبالؔ کی نثر ونظم پر مبنی ایک چھوٹی سی کتاب شائع کی ہے اس میں اقبالؔ کے مختصر سوانح، تصانیف، خطبہ الہٰ آباد خطبہ پنجم (اسلامی ثقافت کی روح) اور بیض اور منظومات کے علاوہ ڈاکٹر محمد التونجی اور ڈاکٹر عبدالمُبین المُلوحی کے مقالات شامل ہیں۔علامہ اقبالؔ کے عمومی تعارف کے لئے یہ ایک مفید مجموعہ ہے ۱۰

۱۰۔ ڈاکٹر عبد الهادی الفضلی: "المسؤلیة الخُلقیة فی فکر الدکتور مُحمد اقبالؔ"

یہ کتابچہ جامعۃ الملک عبدالعزیز جدّہ کے ڈاکٹر عبدالہادی الفضلی کا نتیجہ فکر ہے انہوں نے فکر اقبالؔ میں اخلاقی ذمہ داری کے موضوع پر بحث کی ہے۔

ان کا خیال ہے کہ اقبالؔ کے منابع ومصادر گوناگوں اور متفرق ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ ایک روحانی مورالسٹ ہیں۔ ان کے اخلاقی معیارات اسلامی ہیں اور فکر قرآنی سے ماخوذ ہیں۔ اقبالؔ کے نزدیک انسانی کیریکٹر کی انتہا رضائے الٰہی ہے۔ سب سے برتر نیکی یا خیر اسلام ہے۔ انسانی زندگی میں کسی مقصد و غایت کی تعیین اور پھر اس کے لئے تگ و دو اور جدوجہد ہی سے معنویت پیدا ہوتی ہے۔ ارادے کی آزادی اسکا حق ہے۔ [11]

۱۱۔ **پروفیسر محمد منوّر**: ''اُبحاث. ذکری اقبال الئویہ''

۱۹۷۷ء میں بین الاقوامی اقبالؔ کانفرنس پاکستان میں منعقد ہوئی جس میں ۱۹۲ علما وفضلاء ماہرین اقبالیات نے شمولیت کی اس میں پاکستان کے علاوہ مصر، عراق تونس، شام، سوڈان سے بھی ماہرین اقبالیات تشریف لائے تھے اور کانفرنس میں مقالات پیش کیے۔ انہی مقالات پر مبنی یہ مجموعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ اقبالیات کے صدر پروفیسر محمد منور نے ترتیب دے کر ۱۹۸۲ء میں شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں مرتب کے مقدمہ کے علاوہ مندرجہ ذیل مقالہ نگار حضرات کے مضامین اور منظومات شامل ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر عبدالودود شلبی: محمد اقبالؔ: امیر الشعراءِ اسلام

۲۔ ڈاکٹر محمد السعید جمال الدین: اقبالؔ مصر میں

۳۔ ڈاکٹر حسین علی محفوظ: ورثہ اقبالؔ پر ایک نظر

۴۔ ڈاکٹر محمد سویسی: محمد اقبالؔ: شاعر پاکستان اور شاعر وحدت اسلامی

۵۔ پروفیسر بوند مانوئیل والیتیر: محمد اقبالؔ اور مغربی ثقافت سے اس کا تعلق

۶۔ پروفیسر عبدالمبین الملوحی: محمد اقبالؔ شاعر اسلام اور فلسفی انقلاب

۷۔ پروفیسر حسین مجیب مصری: اقبالؔ اور قرآن۔

۸۔ ڈاکٹر عبدالرزاق محی الدین: یاد اقبالؔ (نظم)

۹۔ پروفیسر مبارک مغربی: اقبالؔ شاعر مشرق (نظم)

۱۲۔ ڈاکٹر ظہور احمد اظہرؔ: "اقبالؔ العرب علی دراساتِ اقبالؔ"

زیر نظر کتاب اصل میں ان مقالات پر مبنی ہے جو مصر کے مختلف جراید و مجلّات میں مصری علماء نے اقبالؔ کی حیات، اُن کے فن، فلسفہ اور پیغام پر تحریر کئے ہیں۔ ان قیمتی مقالات اور مباحث کو پنجاب یونیورسٹی لاہور کے صدر شعبہ عربی پروفیسر ظہور احمد اظہرؔ نے جمع و ترتیب دیا ہے اور ۱۹۷۷ء میں شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں مرتب کے مقدمہ اور مولانا علی میاں کے مقالہ کے علاوہ درج ذیل مصری علماء کے مقالات شامل ہیں۔

۱۔ پروفیسر عباس محمود العقاد: یاد اقبالؔ: ایک انسانی فریضہ

۲۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام: فلسفہ اقبالؔ اور اسکی اساس

۳۔پروفیسر محمد حسین ہیکل: اقبالؔ شاعر اسلام

۴۔ ڈاکٹر محمد کامل موسیٰ: اقبالؔ: جس نے نفع انسانیت کے لئے اپنے آپ کو وقف کیا

۵۔ پروفیسر حسن الزیات: یاد اقبالؔ

۶۔ ڈاکٹر طه حسین: اقبالؔ اور ابو العلاء المعری

۷۔ پروفیسر فتحی رضوان: اقبالؔ بحیثیت فلسفی

۸۔ ڈاکٹر سلمان حزین: یاد اقبالؔ

۹۔ ڈاکٹر عثمان امین: محمد اقبالؔ کا پیغام

۱۰۔ ڈاکٹر احمد شرباصی: شاعر اسلام اقبالؔ کی خوشبوؤں میں سے

۱۱۔ ڈاکٹر حسن عبدالظاهر: محمد اقبالؔ۔ایک داعی اسلام ایک مجدد

۱۲۔ ڈاکٹر عبد المعُطی بیومی: محمد اقبالؔ۔اسلام میں فلسفہ قوت وعمل

۱۳۔ ڈاکٹر عبدالودود شلبی: محمد اقبالؔ

۱۴۔ پروفیسر سمیر عبدالحمید ابراهیم: فکر اقبالؔ میں الازہر.

(الازہر یونیورسٹی کے وائس چانسلر شیخ المراغی کے نام اقبالؔ کا خط اور اس کا جواب)

۱۵۔ اقبالؔ (مجموعه مقالات) مرتب درج نہیں۔قاہرہ ۱۹۵۶ء۔

۱۶۔ ذکریٰ محمد اقبالؔ (مجموعه مقالات) مرتب درج نہیں، دار الفکر دمشق۔

۱۷۔ شاعر الاسلام اقبالؔ (مجموعہ مقالات) سفارت خانہ پاکستان، جدہ ۱۹۵۸ء

۱۸۔ ڈاکٹر حسین مجیب المصری: اقبالؔ بین المصلحین الاسلامیین. قاهره ۱۹۸۱ء

۱۹۔ ڈاکٹر حسین مجیب المصری: اقبالؔ والقرآن، قاهره ۱۹۷۸ء

۲۰۔ ڈاکٹر حسین مجیب المصری: اقبالؔ و العالم العربی، قاهره ۱۹۷۶ء

۲۱۔ احمد مُعوض: اقبالؔ حیاته و آثاره، مصر ۱۹۸۰ء

۲۲۔ صاوی شعلان: فلسفة اقبالؔ، قاهره ۱۹۵۰ء

۲۳۔ محمد الکتانی: محمد اقبالؔ. مفکراً اسلامیاً. ۱۹۷۸ء

۲۴۔ ڈاکٹر محمد البهی: الفکر الاسلامی الحدیث وَصِلَتُه‘با لاستعمار الغربی مصر ۱۹۶۰ء

۲۵۔ ڈاکٹر حمید مجید هدو: اقبالؔ: الشاعر والفیلسوف والانسان نجف، ۱۹۶۳ء

حوالے

۱) ظہور احمد اظہر: اقبال کا پہلا عرب مترجم۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام (مقالہ سہ ماہی مجلّہ اقبال، اپریل ۱۹۷۰ء، ص، ۵۹۔

۲) رفیع الدین ہاشمی: کتابیات اقبال

۳) رفیع الدین ہاشمی: مقالہ: اقبال مصر میں۔ در کتاب اقبال شناسی اور جرنل ریسرچ مرتب رفیع الدین ہاشمی، بزم اقبال، لاہور، پاکستان ۱۹۸۹ء ص ۲۵۱

۴) مولانا ابوالحسن علی ندوی: لقوش اقبال، لکھنو ۱۹۷۲ء، ص ص ۳۸۔۳۹

۵) مولانا ابوالحسن علی ندوی: ایضاً، ص ۱۲

۶) رفیع الدین ہاشمی: ۱۹۸۶ء کا اقبالیاتی ادب۔ ایک جائزہ، اقبال اکادمی، پاکستان، ۱۹۸۸ء ص ۱۳۳

۷) رفیع الدین ہاشمی: ایضاً، ص ۱۳۳

۸) رفیع الدین ہاشمی: ایضاً، ص ص ۱۳۲۔۱۳۳

۹) رفیع الدین ہاشمی: ایضاً، ص ۱۳۴

۱۰) رفیع الدین ہاشمی: ایضاً، ص ۱۳۷

۱۱) رفیع الدین ہاشمی: ایضاً، ص ۱۴۲

۱۲) رفیع الدین ہاشمی: ایضاً، ص ۱۳۰

ابوعلی مسکویہ

اقبالؔ کی نظر میں

مسکویہ کو اسلامی افکار کی تاریخ میں ایک اہم اور منفرد مقام حاصل ہے۔وہ پہلے مسلم فلسفی تھے جنھوں نے اسلام میں پورا نظام اخلاق مرتب کیا۔مسکویہ سے قبل اخلاقی مسائل یا تو مذہبی مباحث کے ساتھ ملے ہوئے تھے یا تصوف کے ایک حصہ کے طور پر ان کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔کبھی کبھی اخلاقی مباحث سیاسی فلسفہ کے مقدمہ کے طور پر بیان ہوتے تھے یا کہانیوں یا اساطیر کا رنگ اختیار کر لیتے تھے۔مسکویہ نے اخلاقیات کو ایک آزاد اور مستقل بالذّات مرتبہ عطا کیا۔اور اس کو اسلامی علوم کا لازمی حصہ بنا دیا۔ان کی حیثیت اس میدان میں ایک پیش رو کی ہے۔اور ان کے اثرات بعد میں اخلاقیات پر لکھنے والے تمام حکماء کی تحریروں میں جابجا نظر آتے ہیں۔[1]

ابوعلی احمد بن محمد بن یعقوب مسکویہ غالباً ۳۲۰ھ میں رے میں پیدا ہوئے۔والد کے انتقال کے بعد ماں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔ماں کی دوسری شادی ہو جانے پر ماں بیٹے کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے۔لہٰذا وہ

خاطر خواہ تعلیم و تربیت حاصل نہ کر سکے۔البتہ قیاس ہے کہ انہوں نے قرآن، حدیث، فقہ، ادب، تاریخِ عرب، حساب، اقلیدس وغیرہ کی ابتدائی تعلیم، مروجہ طریقہ کے مطابق مساجد ہی میں حاصل کی ہوگی۔

مالی حالت کو درست کرنے کے لیے کیمیا گری میں وقت ضائع کیا۔ بعد ازاں بویہی امیر الامرا معز الدولہ کے وزیر المہلبی (م۳۵۲ھ) کے ندیم بن گئے۔[۲] المہلبی کے دربار میں ان کا کام عریاں اور اخلاق سوز نظموں کا موزوں کرنا اور پیش کرنا تھا۔اور دربار کے تمام اخلاق سوز کاموں میں شمولیت بھی کرنا تھا۔جس کا تذکرہ مسکویہ نے بڑی حسرت کے ساتھ اپنی مشہور و معروف تصنیف ''تہذیب الاخلاق'' میں بھی کیا ہے۔[۳] المہلبی کے انتقال کے بعد مسکویہ بغداد سے واپس رے آئے اور بویہی امیر رکن الدولہ کے مشہور وزیر ابوالفضل ابن العمید (م۳۶۰ھ) کے کتب خانہ کے ناظر مقرر ہوئے۔ابن العمید کا کتب خانہ فلسفہ، مذہب، ادب، تاریخ اور طب و شاعری غرض تقریباً ہر موضوع پر بیش بہا خزانہ تھا، یہ کتب خانہ ابن العمید کو اپنی تمام املاک سے عزیز تھا۔[۴] یہاں مسکویہ کو مطالعہ کرنے کا پورا موقع ملا۔ابوالفضل کے بعد ان کے فرزند ابوالفتح ابن العمید وزیر مقرر ہوئے، جنھوں نے مسکویہ کو اپنے عہدے پر بر قرار رکھا۔ابوالفضل کے حین حیات مسکویہ کا ایک خاص کام یہ بھی ہوتا تھا کہ ابو الفتح ابن العمید کی تعلیم و تربیت کریں۵، ابوالفتح (۳۶۶ھ) کے بعد مسکویہ نے

شاہنشاہ عضدالدولہ کے دربار میں جگہ حاصل کرلی۔اورز بردست اثر ورسوخ کے مالک بن گئے۔ وہ عضدالدولہ کے ناظر کتب خانہ،خزانچی اور نجی سفیر کے طور پر بھی کام کرتے تھے۔۶ عضدالدولہ کے انتقال کے بعدان کے بیٹوں صمصام الدّولہ،شرف الدولہ اور بہاء الدولہ نے بھی مسکویہ کی حیثیت برقرار رکھی۔۷ بویہی وزراء اور امراء کی سینتیس سال خدمات انجام دینے کے بعد مسکویہ خوارزم شاہ کی خدمت میں بحیثیت ایک طبیب رہنے لگے۔۸ اسی دربار میں جب ان کی عمر پختہ ہوگئی تھی،انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ انھوں نے اپنی حیات کوناؤونوش میں برباد کیا ہے۔اورانھیں اخلاقی قدروں کا احساس ہوا۔جس کے نتیجہ میں انھوں نے اور کتابوں کے علاوہ ایک لازوال کتاب ''تہذیب الاخلاق'' اخلاقیات پراور مابعدالطبعیات پر''الفوز الاصغر'' تصنیف کی۔ خوارزم شاہ کے دربار سے نکل کر اپنے بڑھاپے میں عمید الملک کے دربار کی زینت بن گئے۔۹ آخر میں سوسال سے زیادہ عمر پاکر اصفہان میں ۴۲۱ھ میں جان جان آفرین کے حوالہ کردی۔۱۰

مسکویہ اعلیٰ پایہ کے ادیب،شاعر طبیب،مورخ،فلسفی اور معلم اخلاق تھے،انھوں نے ہر موضوع پر گرانقدر کتابیں تصنیف کیں،قدیم وجدید اور مسلم و غیر مسلم علماء ومستشرقین مسکویہ کی تصانیف کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔۱۱ تاریخ میں ان کی شہرہ آفاق کتاب ''تجارب الامم'' اپنی نظیر آپ ہے۔فلسفہ

اخلاق میں تہذیب الاخلاق کے نام سے ہر صاحب علم وفکر واقف ہے۔اس کے متعدد ایڈیشن دنیا کے مختلف ممالک سے شائع ہوئے ہیں۔۱۲؎ اسی کتاب نے بعد کے فلاسفۂ اخلاق کو حد سے زیادہ متاثر کیا ہے۔جن میں غزالی،نصیر الدین طوسی،رفاعہ طحطاوی اور شیخ محمد عبدہ بھی شامل ہیں۔

زیر نظر مقالہ میں ہم مسکویہ کے بارے میں اقبالؔ کے خیالات کو یکجا کرنے کی کوشش کرینگے۔اقبالؔ نے سب سے پہلے مسکویہ کا ذکر اپنے پہلے تحقیقی مقالہ میں کیا ہے۔جس کا اردو ترجمہ فلسفۂ عجم کے نام سے ہوا ہے،اس میں ان کے مابعد الطبعیاتی تصورات کا خلاصہ پیش کیا ہے۔اس مقالہ پر اقبالؔ کو میونخ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا ہوئی تھی۔۱۳؎ اقبالؔ کا خیال ہے کہ مسکویہ کے مابعد الطبعی خیالات الفارابی کے مقابلہ میں زیادہ منضبط ہیں۔۱۴؎ انھوں نے مسکویہ کی مشہور تصنیف ''الفوز الاصغر'' سے ان کے نظام فلسفہ کا خلاصہ پیش کیا ہے۔جس کے جستہ جستہ اقتباسات ہم قارئین کی معلومات کے لئے درج کرتے ہیں۔

انتہائی علت کا وجود: یہاں ابن مسکویہ (مسکویہ) نے ارسطو کی تقلید کی ہے۔اور اس کے اس استدلال کا اعادہ کیا ہے جو حرکت طبعی کے واقعہ پر مبنی ہے۔تمام اجسام میں حرکت کا لاینفک خاصہ ہے۔جو تغیرات کی تمام صورتوں پر حاوی ہے۔اور یہ خود اجسام کی ذات سے ظہور پذیر نہیں ہوتی۔لہٰذا حرکت ایک

خارجی ماخذ یا محرک اولیٰ کو مستلزم ہے۔ تجربہ سے اس مفروضہ کی تردید ہو جاتی ہے کہ حرکت خود اجسام کی ماہیت میں داخل ہے۔ مثلاً انسان میں آزاد حرکت کی قوت ہے، لیکن اس مفروضہ کی بناء پر اس کے مختلف اعضاء کو ایک دوسرے سے علٰحدہ ہونے کے بعد بھی حرکت کرتے رہنا چاہئے۔ لہٰذا علل محرکہ کے سلسلے کو ایک ایسی علت پر جا کر ختم ہو جانا چاہئے جو خود غیر متحرک ہو، لیکن دوسری اشیا کو حرکت دیتی ہو۔ علت اولیٰ کا متحرک رہنا لازمی ہے۔ کیونکہ علت اولیٰ میں حرکت کا فرض کیا جانا ایک غیر متناہی رجعت کا باعث ہوگا جو مہمل ہے۔ ۱۵

روح:

اقبال نے روح کے بارے میں مسکویہ کے خیالات کا خلاصہ یوں بیان کیا ہے:

"یہ سمجھنے کے لیے کہ آیا روح کا وجود مستقل بالذات ہے، ہم کو علم انسانی کی ماہیت سے واقف ہونا پڑے گا۔ مادہ کا یہ لازمی خاصہ ہے کہ وہ دو مختلف صورتیں وقت واحد میں اختیار نہیں کر سکتا۔ اگر ایک چاندی کے چمچے کو چاندی کے پیالہ میں تبدیل کرنا ہو تو یہ ضروری ہے کہ چمچے کی صورت باقی نہ رہے۔ یہ خاصہ تمام اجسام میں مشترک ہے۔ جس جسم میں اس خاصہ کا فقدان ہو وہ جسم ہی نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب ہم ادراک کی ماہیت پر غور کرتے ہیں تو ہم کو انسان میں ایک ایسی قوت دریافت ہوتی ہے، جو وقت واحد میں ایک سے زیادہ اشیاء کو جانتی ہے۔ اور اسی وجہ سے وقت واحد میں مختلف صورتیں اختیار بھی کر سکتی ہے۔ اس

قوت کو مادہ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اس میں مادہ کی اساسی خاصیت کا فقدان ہے۔ روح کی ماہیت ہی یہ ہے کہ وقت واحد میں مختلف اشیاء کا ادراک کرنے کی اس میں قوت پوشیدہ ہے''[۱۶]

روح کے غیر مادی ہونے پر مسکویہ جو دلائل دیتے ہیں اقبالؔ کے نزدیک ان میں بعض دلائل قابل غور ہیں۔

۱) حواس ایک قوی مہیج کا ادراک کرنے کے بعد تھوڑی دیر تک کمزور مہیج کا ادراک نہیں کر سکتے۔ لیکن ذیل کے عمل وقوف کی حالت اس سے بالکل جدا گانہ ہے۔

۲) قوی مہیج کا ادراک حواس کو کمزور کر دیتا ہے اور بعض وقت اس سے مضرت بھی ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف افکار و تصورات کے علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ عقل کی قوت بھی بڑھتی جاتی ہے۔

۳) بڑھاپے میں جو جسمانی کمزوری پیدا ہوتی ہے وہ ذہنی قوت کو متاثر نہیں کر سکتی۔

۴) ہم میں ایک ایسی قوت ہے، جو ہمارے اعضاء پر حکومت کرتی، حسی غلطیوں کی تصحیح کرتی اور ہمارے معلومات میں وحدت پیدا کرتی ہے۔ یہ متحد کرنے والی قوت جو حواس کے پیش کردہ مواد پر غور و فکر کرتی اور ہر حاسہ کی شہادت کا موازنہ و مقابلہ کر کے مختلف بیانات کی نوعیت کا تعین کرتی ہے، ایک

ایسی قوت ہے جس کو مادہ کے دائرہ سے بالاتر ہونا چاہے۔

اقبالؔ اپنے اس خیال کی تائید یہ لکھ کر کرتے ہیں:

''ابن مسکویہ کہتا ہے کہ ان دلائل کی متحدہ قوت سے اس قضیہ کی صداقت قطعی طور ثابت ہو جاتی ہے کہ روح فی الحقیقت غیر مادی ہے۔ روح کا غیر مادی ہونا اس کے غیر فانی ہونے کو متضمن ہے۔ کیونکہ فنا ہونا مادہ ہی کی خصوصیت ہے'' ۱۷

اس کتاب کے علاوہ اقبالؔ نے اپنے شہرہ آفاق خطبات ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' میں بھی کئی جگہ مسکویہ کا تذکرہ کیا ہے۔ سب سے پہلے اپنے خطبہ چہارم'' خودی، جبر وقدر حیات وممات'' میں ''انسان کی نشاۃ اولیٰ'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

''جاحظ پہلا شخص ہے جس نے ان تغیرات کی طرف اشارہ کیا جو نقل مکانی علیٰ ہذا ماحول کے زیر اثر حیوانات کی زندگی میں بالعموم رونما ہو جاتے ہیں۔۔۔ابن مسکویہ (م ۴۲۱ھ) پہلا مسلمان مفکر ہے جس نے انسان کے مبدأ و مصدر کے بارے میں ایک واضح اور متعدد پہلوؤں سے جدید نظریہ پیش کیا'' ۱۸

ظاہر ہے یہاں اقبالؔ نے مسکویہ کے نظریہ ارتقاء کی طرف اشارہ کیا ہے، اسکی تفصیل اقبالؔ نے پانچویں خطبے ''اسلامی ثقافت کی روح'' میں پیش کی ہے، اقبالؔ رقم طراز ہیں:

''افکار ریاضیات کی اس ترقی کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ ارتقاء کا تصور بھی متشکل ہوتا چلا گیا۔ یہ جاحظ تھا جس نے سب سے پہلے ان تبدیلیوں کی طرف اشارہ کیا جو نقل مکانی سے باقاعدہ جانوروں میں رونما ہو جاتی ہیں اور جسے آگے چل کر بیرونی کے ہم عصر ابن مسکویہ نے ایک باقاعدہ اور مرتب نظریے کی شکل دی اور پھر الٰہیات میں اپنی تصنیف ''الفوز الاصغر'' میں اس سے کام لیا لیکن ہم یہاں ابن مسکویہ کے مفروضہ ارتقاء کا ایک خلاصہ پیش کر رہے ہیں تو اس کی علمی قدر و قیمت کے خیال سے نہیں بلکہ صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ مسلمانوں کے افکار علم کس سمت میں حرکت کر رہے تھے۔

ابن مسکویہ کہتا ہے نباتات کی زندگی پر نظر ڈالئے تو ارتقاء کے اولین مراحل میں نہ تو ان کی پیدائش اور نمو کے لئے بیج کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ اپنی نوع کے تسلسل کے لئے انھیں اس سے کام لینا پڑتا ہے۔ لہٰذا اس مرحلے پر ہم نباتات کی زندگی اور معدنیات میں یونہی فرق کریں گے کہ یہ وہ مرحلہ ہے جس میں نباتات کو تھوڑی بہت حرکت کی طاقت مل جاتی ہے اور پھر اعلیٰ تر انواع کی صورت میں برابر بڑھتی رہتی ہے۔ تآنکہ اس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ پودے شاخیں نکالتے اور بیجوں کے ذریعے اپنی نوع کا تسلسل قائم رکھتے ہیں۔ لیکن پھر حرکت کی اس قوت میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ درخت پیدا ہو جاتے ہیں، ان کے تنے ہوتے ہیں اور وہ برگ و بار لاتے ہیں۔

اب اس سے بھی آگے بڑھیے تو نباتات کے ارتقاء کا آیندہ مرحلہ وہ ہے جس میں ایسی انواع کا ظہور ہوگا جن کے لئے زیادہ بہتر زمین اور زیادہ بہتر آب و ہوا کی ضرورت ہوگی۔ انگور اور کھجور ارتقائے نباتی کی آخری منزل ہیں۔ جس کے ڈانڈے گویا حیوانی زندگی سے جا ملتے ہیں۔ چنانچہ کھجور کے اندر تو جنسی اختلاف بھی صاف طور پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کھجور میں جڑوں اور ریشوں کے علاوہ وہ شے بھی نشو نما پا لیتی ہے۔ جس کا وظیفہ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے دماغ کا اور جس پر گویا اس کی سلامتی اور حفظ و بقا کا دارومدار ہے، یہ نباتات کی زندگی میں ارتقاء کا آخری درجہ ہے۔ یا یوں کہئے کہ حیوانی زندگی کی تمہید حیوانی زندگی کا پہلا قدم زمین کی پیوستگی سے آزادی ہے جسے گویا شعوری حرکت کی ابتدا سے تعبیر کرنا چاہئے۔ اسے حیوانی زندگی کا آغاز کہئے جس میں اول حس لامسہ اور بالآخر حس باصرہ کا نشو ونما ہوتا ہے۔ مگر پھر جب حواس نشو ونما حاصل کر لیتے ہیں تو حیوانات نقل و حرکت میں آزاد ہو جاتے ہیں مثلاً حشرات الارض، رینگنے والے جانور، چونٹیاں اور شہد کی مکھیاں، چوپایوں میں گھوڑا حیوانیت کا مظہر اتم ہے اور پرندوں میں عقاب، آخر الامر جب بندروں کا ظہور ہوتا ہے تو حیوانیت گویا انسانیت کے دروازے پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بندر باعتبار ارتقاء انسان سے صرف ایک ہی درجہ پیچھے ہیں۔ ارتقاء کے مزید مراحل میں کچھ اور عضویاتی تبدیلیاں ہوتی ہیں، جن کے پہلو بہ پہلو انسان کی قوت تمیز اور روحانیت

میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے، تا آنکہ وحشت کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور انسان تہذیب وتمدن کی دنیا میں قدم رکھ لیتا ہے''۱۹

اس کے بعد اسی خطبہ میں عراقی کے نظریہ کہ ''زمان الٰہیہ تغیر سے عاری ہے'' پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''یہ نظریہ واردات شعور کے ایک ناکافی تجربے پر مبنی تھا۔ عراقی اس نسبت کے فہم سے قاصر رہا جو زمان مسلسل کو زمان الٰہیہ سے ہے۔ اور جو اگر اس کی سمجھ میں آجاتی تو تخلیق مسلسل کا خالصاً اسلامی تصور بھی اس پر منکشف ہو جاتا۔ یعنی یہ حقیقت کہ کائنات اضافہ پذیر ہے۔۲۰ اس سلسلہ میں مسکویہ ہی کے نظریۂ ارتقاء کو سامنے رکھ کر تحریر فرمایا ہے۔

بہر حال اسلامی فکر نے جو راستہ اختیار کیا اس کی انتہا جس پہلو اور جس رنگ میں بھی دیکھئے کائنات کے حرکی تصور پر ہوئی اور پھر جسے ابن مسکویہ کے اس نظریہ سے کہ زندگی عبارت ہے ایک ارتقائی حرکت سے، مزید تقویت پہنچی''۲۱

اسی خطبہ پنجم یعنی ''اسلامی ثقافت کی روح'' میں ابن خلدون کے تصور زمانہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ہم اس کا شمار برگسان کے پیشرووں میں کریں گے۔ اسلامی تہذیب وثقافت کی تاریخ میں اس تصور کے ذہنی سوابق کی طرف ہم اس سے پہلے اشارہ کر آئے ہیں۔۔۔۔۔ اسلامی مابعد الطبیعیات کا یہ رجحان کہ زمانہ ایک خارجی حقیقت ہے ابن مسکویہ کا نظریہ کہ زندگی عبارت ہے ایک ارتقائی حرکت سے۔۔۔۔۔ یہ سب باتیں ابن خلدون کو ذہناً ورثے میں

ملیں''۲۲

اس اقتباس کی رو سے اقبالؔ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ابن خلدون جیسے ''سب سے زیادہ روشن اور تابناک'' شخصیت کی تعمیر اور خیالات کی بلندی میں لازمی طور پر مسکویہ کے افکار و خیالات کا اثر اور حصہ ہے۔ اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اقبالؔ کی نظر میں مسکویہ کا مقام کیا ہے۔

مراجع

۱) پروفیسر عمر الدین: دیکھئے محمد عبدالحق انصاری کی انگریزی کتاب ایتھیکل فلاسفی آف مسکویہ کا مقدمہ

۲) مسکویہ: تجارب الامم، جلد۶۔ ۱۹۱۵ء رپرنٹ مکتبہ المثنیٰ بغداد۔ص ۱۴۶۔

ابو سلیمان السجستانی: منتخب صوان الحکمت ہ۔ نیویارک ۱۹۷۹ء ص ص ۱۵۱۔۱۵۶

۳) مسکویہ: تہذیب الاخلاق۔قاہرہ ۱۳۲۹ھ بیروت ۱۹۶۶ء۔ ص ۵۰

۴) ایضاً ص ۵۲۵ ببعد

۵) ابو الحیان التوحیدی: اخلاق الوزیرین۔دمشق ۱۹۶۵ء۔ص ۳۴۶

۶) القفطی: تاریخ الحکماء۔لیپزگ ۱۹۰۳ء۔ص ۳۳۱

تجارب الامم جلد۶ ص ۲۹۱

۷) الثعالبی: تتمتہ الیتمیتہ۔تہران ۱۳۵۳ھ جلد۱۔ص ۹۶

۸) العاملی: الاعیان الشیعتہ۔دمشق ۱۹۳۸ء جلد۱۰ص ۱۴۱

۹) مِسکویہ: تجارب الامم گب میموریل سیریز ۱۹۰۹ء جلد انوٹ ص

الحکمتہ الخالدہ قاہرہ ۱۹۵۳ء۔ دیکھئے مقدمہ از

عبدالرحمان البدوی۔ص۔۲۰،عمید الملک کی شخصیت کے
بارے میں جناب بدوی نے محققانہ بحث کی ہے۔

۱۰)الخوا نساری: روضات الجنات،اصفہان ۱۳۶۷ھ۔ص ۱۷

یاقوت الحموی: معجم الادبا۔قاہرہ ۱۲۹۹ھ جلد ۵،ص ۵۔

حاجی خلیفہ: کشف الظنون۔قسطنطیہ ۴۳۔۱۹۴۱ء،ص ص ۳۴۴۔۵۱۴

اسماعیل پاشا: ھدیة العارفین۔استنبول،۱۹۵۱ء۔۱۹۵۵ء،جلد ۱،ص ۷۳

الاعیان الشیعة،جلد ۱۰،ص ۱۴۰

جرجی زیدان: تاریخ الآداب اللغة العربیه۔قاہرہ ۱۹۳۱ء
جلد ۲،ص ۱۳۱۷الحکمته الخالده۔دیکھئے مقدمہ از عبد
الرحمان البدوی۔ص ۲۰

۱۱) الاعیان۔جلد ۱۰،ص ۱۴۵۔

تاریخ الحکماء۔ص ۳۳۱

منتخب صوان الحکمته۔ص ص ۱۵۱۔۱۵۶

تاریخ الآداب اللغة العربیه۔جلد ۲،ص ۳۴۷

روضات الجنات۔ص ۷۰۔

۱۲) تہذیب الاخلاق کے اب تک اٹھارہ ایڈیشن شائع ہو چکے
ہیں۔اس کا بہترین ایڈیشن کانسٹینٹین زریق نے ۱۹۶۶ء
میں امریکن یونیورسٹی بیروت سے شائع کیا ہے۔

۱۳)مولانا عبد السلام ندوی:اقبال کامل،۱۹۷۵ء،ص ۱۲

۱۴) فلسفہ عجم۔ مترجم میر حسن الدین حیدر آباد ۱۹۵۶ء ص ۳۸

۱۵) فلسفہ عجم، ص ۳۹

۱۶) فلسفہ عجم، ص ص ۴۵۔۴۶

۱۷) فلسفہ عجم، ص ص ۴۷۔۴۸

۱۸) اردو ترجمہ از سید نذیر نیازی بعنوان تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ ہندوستانی ریپرنٹ۔ اسلامک بک سینٹر۔ دریا گنج نئی دہلی ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۳

۱۹) تشکیل جدید۔ ص ص ۲۰۵۔۲۰۷

۲۰) تشکیل جدید۔ ص ۲۱۱

۲۱) تشکیل جدید۔ ص ۲۱۲

۲۲) تشکیل جدید۔ ص ۲۱۷

محمد اقبالؔ

اساطین علم وادب اور زُعماء دعوت وفکر کی نگاہ میں

اس مختصر مقالے میں ہم بین الاقوامی شہرت کے اسلامی مفکرین اور عربی زبان وادب کے چوٹی کے ادباء، مفکرین اور دانشورانِ عرب کا اقبالؔ کے تئیں اُن کے خراج عقیدت کے اقتباسات درج کررہے ہیں جس سے بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عربوں کے یہاں اقبالؔ کی مقبولیت اور احترام کا راز کیا ہے؟

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ:

اقبالؔ وہ شاعر ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کے مطابق بعض حکم وحقائق کہلوائے ہیں جو کسی دوسرے معاصر شاعر ومفکر کی زبان سے نہیں ادا ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ پیغام محمدیؐ کے بقائے دوام، امت مسلمہ کے استحکام اور اسکی قائدانہ صلاحیت، عصری نظریات وفلسفہ کی بے مائیگی پر اُن کے پختہ عقیدہ سے ان کی فکر میں وضاحت اور پختگی آئی ہے اور ان کی خودی کی تعمیر ہوئی ہے۔ اس معاملے میں وہ خاص کر دینی علوم کے ان فضلاء سے بھی آگے ہیں جو

مغربیت کی حقیقت سے واقف نہیں اور نہ انہیں ان کے حقیقی اغراض و مقاصد اور تاریخ سے گہری واقفیت ہے۔

میں نے انہیں اولوالعزمی، محبت اور ایمان کا نواخواں شاعر پایا اور اپنے بارے میں میری گواہی یہ ہے کہ جب جب بھی ان کا کلام پڑھا تو دل جوش سے امنڈنے لگا اور لطیف جذبات نے انگڑائیاں لینا شروع کر دیں۔ احساسات اور کیفیات کی لہریں بیدار ہونے لگیں اور لوگوں میں شجاعتِ اسلامی کی رَو دوڑنے لگی، میری نظر میں یہی اُن کے شعر کی اصلی قدر و قیمت ہے۔ (ترجمہ شمس تبریز خان)

ڈاکٹر طٰہٰ حسین:

اہل اسلام میں دو شاعر ایسے ہو گزرے ہیں جنہوں نے اسلامی ادب کا پایہ آسمان تک پہنچا دیا اور اسکی عظمت کا نقش جبینِ وقت پر ثبت کر دیا۔ ایک ہند و پاک کا شاعر اقبالؔ اور دوسرے عرب کا شاعر ابوالعلا۔

میں چاہتا ہوں کہ ہم لوگ حق گذار بنیں اور اپنے لئے خوئے کریمی اختیار کریں اور کریمی کا اولین تقاضا یہ ہے کہ ہم صاحب حق کے حق کا اعتراف کریں اور ہم اقبالؔ کو یاد کر کے وہ قرض اتاریں جو اسکی طرف سے ہم سب پر واجب الادا ہے کیونکہ وہی تو ہے جس نے ہمیں بھلائی کی دعوت دی اور ہمارے درمیان اس تصور کو عام کیا کہ ہم اپنے آپ کو اور اپنے حقوق کو پہچانیں اور حق، خیر اور جمال کے لئے مصروف جہاد ہوں۔ (اردو ترجمہ خورشید رضوی)

عباس محمود العقاد:

اقبالؔ عظمت کے نقاش ہیں، مشرق کو ان کی اس وقت بھی ضرورت ہے اور مستقبل میں ضرورت رہیگی۔ ان کی عظمت مادی و دنیوی عظمت ہے نہ دنیا سے اعراض کر کے آخرت کی عظمت بلکہ وہ دنیا و آخرت کی انتہاؤں کے بین بین کام کرنے کے زعیم ہیں۔ وہ ان دو کے درمیان بہترین قوّام کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

پروفیسر عبدالوہاب عزّام:

اگر جلال الدین رومی اس زمانے میں جی اٹھیں تو وہ محمد اقبالؔ ہی ہونگے۔ ساتویں صدی کے جلال اور چودھویں صدی کے اقبالؔ کو ایک ہی سمجھنا چاہئے۔

اقبالؔ! اے شاعرِ اسلام! تو نے اسلام کے مقاصد واضح کر دئے ہیں، اس کے فضائل کو جِلا بخش دی ہے، اسکے چراغ کو روشن کر دیا ہے اور اس کے اصولوں کی توضیح کر دی ہے۔ تو نے ملتِ اسلامیہ کو ایسی عزت اور بلندی کی دعوت دی ہے جو ان کے منصب کے لئے موزون ہے جو ان کے طریق زندگی اور تاریخ کے عین مطابق ہے۔

اقبالؔ! اے شاعر مشرق! تو نے مشرق کے فضائل و محاسن کی تائید کی ہے

اوراس کی روحانیت پر فخر کیا ہے۔تو نے مغرب کی مادیت اور غرور کا مواخذہ کیا، مغرب کے زعماء پر تنقید کر کے ان کے طلسم قیادت کو پاش پاش کر دیا اور تہذیب مشرق کے فواید ونقصانات کو عدل کے ترازو میں تولا ہے۔

اقبالؔ! اے شاعر زندگی! تو نے زندگی کے حقائق کی نقاب کُشائی کی ہے اسکی رفتار اور منزل کو اپنی چشمِ بصیرت سے دیکھا ہے اس کے لُبِ لباب کو سمجھا اور اس کے نشیب وفراز کی نشاندہی کی ہے۔

اقبالؔ! اے شاعرِ خودی! تو نے خودی کے رازوں سے پردہ اٹھایا ہے اور اس کے اسرار کو عیاں کیا ہے۔تو نے خودی کی مُخفی قوت، روشنی اور تڑپ کو واضح کر دیا ہے اور خودی کے خزانوں کو نکالنے اور اسکی پوشیدہ صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا ہے۔

برکش ایں نغمہ کہ سرمایۂ آب وگل تُست
اے زِخودرفتہ تہی سوز نوائے دِگراں

اقبالؔ! اے بے خودی کے شاعر! تو نے یہ سمجھا دیا ہے کہ ایثار وقربانی کا جذبہ کیا ہے اور فرد اور جماعت کا ربط کیا ہے۔

اقبالؔ! اے شاعرِ آزادی! تو نے آزادی کا چرچا کیا، اِسے نعمت عُظمیٰ

قرار دیا۔ مکمل آزادی کی دعوت دی اور ہر مشکل اور ہر قسم کی غلامی کو ٹھکرا دیا۔

اقبالؔ! اے شاعر جہاد و سرگرمیٔ عمل! تو نے یہ بتا دیا ہے کہ زندگی ایک مُسلسل جہاد اور نہ ختم ہونے والی جد و جہد ہے۔ زندگی ہولناک موجوں میں ہے اور پُرسکوں ساحل پر صرف موت ہے۔

اقبالؔ! اے شاعرِ جمال! تو نے زمین و آسمان میں، خشک و تر میں، چٹیل صحرا اور پُر رونق باغات میں، صبح و شام میں، روشنی اور تاریکی میں جمال و محاسن کو دیکھا بلکہ ہر خُلقِ کریم اور بلند جذبے میں جمال و محاسن کی تجھے تصویر نظر آئی۔

اقبالؔ! اے شاعرِ جلال! تو نے مخلوق میں بلند ہمتوں پختہ عزائم، بڑی آرزوں اور عظیم مقاصد سے اس صاحب جلال و جبروت کی عظمت و سطوت کو عیاں کر دیا ہے۔ (اُردو ترجمہ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر)

پروفیسر احمد حسن الزیّات:

حسانؓ اگر شاعرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اقبالؔ بیشک شاعرِ رسالت ہیں۔ صوفی شعراء نے مجالسِ ذکر کو فضائل اسلام اور شمایل نبوت کے ذکر سے مُعطّر کر دیا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی اقبالؔ کے تفقہ فی الشریعت و حقیقت کے مقام پر پہنچ نہ سکا ان میں سے کوئی بھی کتاب اللہ پر ایک فلسفی کے مقامِ غور و فکر پر نہ پہنچ سکا کلام نبوت پر علمی نگاہ ڈالنے کے لحاظ سے اور نہ مشرقِ قدیم اور مغربِ جدید میں قوت تمیز، سلامتی فہم اور صحتِ حُکم کے مقام پر فائز ہو سکا۔

ڈاکٹر احمد شرباصی:

میں نے کسی شاعر کو نہیں دیکھا جو مسلمان کی ایسی عالی اور مثالی تصویر پیش کرتا ہے جیسی اقبالؔ اپنے اشعار میں پیش کرتے ہیں وہ مسلمان کی ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ گویا وہ رِقّت میں پانی ہے اور شِدّت کے لحاظ سے فولاد ہے۔ وہ خاک سے بالاتر ہے، افلاک کی سیر کرتا ہے اور فرشتوں کے ساتھ اُڑان بھرتا ہے۔

سید قطب شہید:

محمد اقبالؔ اور میں اکثر و بیشتر معنی میں مُتفِق ہوتے ہیں اور عموماً الفاظ میں بھی توافق ہوتا ہے۔

ڈاکٹر نجیب کیلانی:

اقبالؔ نے شاعری کو محض فلسفہ رہنے نہیں دیا۔ انہوں نے شاعری کو گلستانوں، ستاروں اور غفلت سے نکال کر میدان جدو جہد میں لایا۔ وہ چاہتے ہیں کہ شعر فکر کے مختلف رنگوں، سچے خیالات، حقایقِ وجود، حقیقتِ کائنات کے ساتھ ملکر انسانی عقول کو صَیقَلِ کردے اور آزادی کا وثیقہ لکھے۔

اقبالؔ خیال کو حقایق کی خالص شراب سے ملاتے ہیں اور عقلیات وجذبات کا حسین امتزاج کرتے ہیں۔

شیخ صاوی شعلان:

اقبالؔ کے بغیر کوئی اور غیر عرب شاعر نہیں جس نے اسلام اور عربوں کے مجد وشرف کے گُن گائے ہوں۔ انہوں نے ''عَرُوبہ'' کے گیت گائے۔ قوموں کی ترقی میں اسلام کے رول پر بات کی۔ خالص عرب مسائل جیسے قضیہ فلسطین، صقلیہ اور قرطبہ میں عربوں کی شجاعت اور مجد وشرف کو مُسجّل کر دیا۔ عربوں کے آپسی افتراق پر خون کے آنسو بہائے اور اپنے دواوین میں عرب عوام اور امراء سے مخاطب بھی ہوئے۔

علامہ محمود محمد شاکر:

سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے ورطہ حیرت میں ڈالدیا وہ پیرس کی مسجد میں داخل ہونے سے اقبالؔ کا انکار ہے ان کا یہ کہنا کہ یہ مسجد دمشق کی بربادی کی بہت ہی کم قیمت ہے۔، ان کے ذکر دائم میں ہونے کا ثبوت ہے۔ ہم میں سے کتنے ہوں گے جن کے اذہان میں اپنے دین اور اپنی ثقافت کی تاریخ اسطرح مُستحضر ہوگی۔

پروفیسر انور الجُندی:

اقبالؔ ہمارے زمانے کے واحد شاعر ہیں جنہوں نے صحیح معنوں میں اپنی شاعری کا رُخ اسلام کیطرف موڑ دیا۔

انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ایک جدید اُمت اسلامیہ کے لئے راستہ ہموار کیا جو توحید خالص، اسلام کے پیغام پر گہرے ایمان اور دنیا میں قرآن کی تبلیغ پر مبنی ہو۔

اقبالؔ مغرب میں رہے۔ مغربی افکار کا مطالعہ کیا۔ مگر اُن کا علم اور ثقافت اسلام کی امانت تھے وہ ان لوگوں میں سے نہیں جن کو مغربی افکار نے اپنے گھیرے میں لیا ہو۔

اقبالؔ کی نظر میں اسلام انسانیت کی اصل ہے اور وحدت آدم و عالم کے لئے واحد راستہ ہے۔ اقبالؔ کو اس بات پر ایمان ہے کہ عرب اولین اسلام کے قُوت تھے اور دنیا میں اُن کا غلبہ و تمکّن اسلام کی نُصرت کے لئے ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عصرِ جدید میں اقبالؔ اسلام کے کوکبِ درخشاں ہیں جو انسانیت کی راہنمائی کے لیے مسلسل ضِیا بار رہیگا۔

ڈاکٹر عبدالودود شَلبی:

اقبالؔ دنیائے عجم میں اللہ کے دین کی زبان ہیں۔ جو حکمت سے قرآن کی تفسیر کرتے ہیں اور شعر میں ایمان کی تصویر کشی کرتے ہیں وہ مشرقی تہذیب کی طرف دعوت دیتے ہیں جس کا خمیر اللہ اور رُوحانیت سے اٹھتا ہے۔ وہ مغربی تہذیب سے متنفر ہیں جسکی اساس انسان اور مادیت ہے۔ اقبالؔ اسلام کے گُن گاتے ہیں جس نے نوعِ انسانی کو غلامی سے نجات دلائی اور نفوسِ انسانی کو

طہارت نفس عطا کی اور زمین میں اصلاح کر کے امن وامان قائم کر دیا۔

اگر عرب احمد شوقی کو امیر الشعراء قرار دیتے ہیں تو اقبالؔ غیر متنازعہ طور پر شاعرِ اسلام ہیں۔

پروفیسر حُسین علی محفوظ:

حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ ہند میں اسلام کی تیرہ سو سالہ تاریخ کا خُلاصہ ہیں وہ ایک فرد کے لباس میں ایک اُمت ہیں وہ ایک انسان ہیں جس نے ایک اُمت کو زندہ کیا۔

ڈاکٹر محمد حسین ھیکل:

اقبال کا یہ حق ہے کہ ہر مسلم بلکہ ہر صاحبِ فکر وخیال ان کو یاد کرے۔ یہ ایسے فلسفہِ جدید (جسے انہوں نے شعر کے رنگ میں پیش کیا) کے ساتھ نہ صرف عالم اسلام بلکہ تمام عالم پر طلوع ہوئے۔ جس سے انسانی جذبات واحساسات اور قلوب برانگیختہ ہوتے ہیں یہ خیالات دنیا کے عظیم مفکرین کو حیرت میں ڈالدیتے ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ یہ مُسلم تو ہند میں تولُد ہوئے اسکے عوام کے درمیان پروان چڑھے، اسکے بعد ایک ایسا فلسفہ پیش کیا جو کسی طور فلسفہ ہندی سے متفق نہ تھا۔

وہ ایک نئے عالم کی طرف راہنمائی کرتے ہیں جو اخوتِ انسانی کی دنیا

ہے، جو توحید و ایمان کے سائے میں پنپتی ہے، جسمیں محبت، عمل اور ادب موجود ہیں۔

ڈاکٹر محمد کامل موسیٰ:

اقبالؔ صرف پاکستان کے ہی فرزند نہیں ہیں۔ وہ صرف مشرق کے ہی خادم نہیں ہیں۔ وہ صرف عربوں کے ہی حامی نہیں ہیں، وہ صرف اسلام ہی کے شاعر نہیں ہیں بلکہ وہ اُن شاذ شخصیات میں سے ہیں جنہوں نے نبی نوع انسان کی منفعت اور انسانیت کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کیا۔ وہ دورِ جدید کے بہترین قایدینِ اصلاح میں سے ایک ہیں۔

سیرت نبوی ﷺ اور مستشرقین کے اعترافات

محسن انسانیت محمد ﷺ ایک ہمہ گیر پیغام انقلاب کے داعی تھے۔اس انقلاب نے آپ ﷺ کے حین حیات ہی اسوقت کی مذہبی، سیاسی اور اقتصادی قوتوں میں ایک تہلکہ بپا کر دیا اور آپ ﷺ کے بعد بھی آپ کا پیغام تاریخ عالم پر برابر اثر انداز ہوتا رہا اور ہو رہا ہے۔

محمد ﷺ کی اسی انقلاب انگیز شخصیت نے قدیم و جدید، موافق و مخالف مفکروں، دانشوروں اور اہل علم و ادب کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اپنی اپنی صوابدید اور نظریہ کے مطابق لکھنے پر مجبور کر دیا۔اگر یہ کہا جائے کہ دنیا کی جس شخصیت کے بارے میں سب سے زیادہ لکھا گیا وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس ہے تو مبالغہ ہوگا۔

سیرت رسولؐ پر لکھنے والے اہل علم میں مستشرقین حضرات اپنی مخصوص فکر اور طریقہ مطالعہ کے لحاظ سے ہماری خاص توجہ کے مستحق ہیں۔زیر نظر مقالہ میں اسی موضوع پر ہم مختصراً اپنی معروضات پیش کریں گے۔

''استشراق اور مستشرق کی اصطلاحیں لغوی اعتبار سے بہت زیادہ قدیم

العہد نہیں ہیں بلکہ انگریزی زبان وادب میں ان کا استعمال اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں اٹھارویں صدی کے اواخر میں شروع ہوا چنانچہ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کی تصریحات کے مطابق مذکورہ بالا دونوں الفاظ اورینٹ (Orient) سے مشتق ہیں جس کے معنی ہیں مشرقی یا مشرقی سمت جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے پھر اسی سے اورینٹل (Oriental) ہے یعنی مشرقی جو تمام معنوں میں مغربی (Occidental) کا ضد ہے۔ مشرقی مفہوم میں وہ متوطن بھی ہے جو مشرق یعنی ایشیا یا ان ممالک کا باشندہ ہو جو بحر روم متوسط اور قدیم رومی سلطنت کے مشرق میں واقع ہیں جبکہ اورینٹلزم (Orientalism) یعنی مشرقیت یا استشراق کے معنی ہونگے مشرقیت، مشرقی خصوصیات، مشرقی طرزِ ادا، اقدار، علوم وآداب اور فنون وثقافت وغیرہ سے واقفیت اور مہارت وغیرہ نیز اس کے تحت اورینٹل اسکالرشپ کا مطلب ہوگا مشرقی زبانوں سے واقفیت اور پھر اسی سے بنا ہے اورینٹلسٹ (مستشرق) اس سے مراد وہ شخص ہوگا جو مشرقی زبانوں، علوم وفنون اور تہذیب وتمدن وغیرہ پر عبور رکھتا ہو یا بقول مولوی عبدالحق ماہر مشرقیات ہو۔ عربی میں استشراق کے لغوی معنی ہوں گے بہ تکلف مشرقی بننا اور استشراق کا مطلب ہوگا وہ شخص جس نے بہ تکلف مشرقیت اختیار کی ہو یا مشرقی بنا ہو۔

زبان ولُغت کی مندرجہ بالا بحث سے استشراق اور مستشرق کا مفہوم

اگر چہ کسی قدر واضح ہو جاتا ہے اور مستشرق کی نوعیت و ماہیت بھی بڑی حد تک سمجھی جا سکتی ہے تاہم استشراق کی اصل حقیقت اس وقت سامنے آئی جبکہ استشراق السنۂ مشرقیہ کی واقفیت اور اسلامی علوم و آداب کے ایک رُخی مطالعہ تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ آگے بڑھ کر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ سے بغض و عناد اسکا جزو لازم ٹھہرا۔ شیخ انور الجندی مصری کے بقول حقیقتاً نبی کریم ﷺ کی شخصیت ہی مستشرقین کی ہرزہ سرائی، دسیسہ کاری اور خردہ گیری کا اصل محور و مرکز ہے اس بارے میں ان کا رویہ کبھی بڑا جارحانہ ہوتا ہے اور کبھی مغالطہ آمیز نرم لہجہ اختیار کرتے ہیں۔[1]

علامہ شبلی نعمانیؒ نے مستشرقین کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) وہ جو عربی زبان اور اصل ماخذوں سے واقف نہیں ان لوگوں کا سرمایہ معلومات اوروں کی تصانیف اور تراجم ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ مشتبہ اور نامکمل مواد کو قیاس اور میلان طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں۔

(۲) بعض مستشرقین عربی زبان، علوم و ادب، تاریخ اور فلسفۂ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے نا آشنا ہیں۔ وہ سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھتے لیکن ضمنی طور پر عربی دانی کے زعم میں اسلام یا شارع اسلام ﷺ کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں مثلاً جرمنی کے مشہور فاضل ساخو نے طبقات ابن سعد شائع کی تو اس

کی وسعت معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن جب وہ اسلامی امور کے متعلق باتیں لکھتا ہے تو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ یہ وہی شخص ہے یا کوئی اور۔ نولدیکی نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے لیکن انسائیکلو پیڈیا میں قرآن پر جو اس کا آرٹیکل ہے جا بجا نہ صرف اس کے تعصب بلکہ اس کی جہالت کے رازِ پنہاں کی پردہ دری کرتا ہے۔

(۳) وہ مستشرقین جنہوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے۔ مثلاً پامر یا مارگولیتھ سے ہم کچھ امید کر سکتے تھے لیکن باوجود عربی دانی کثرت مطالعہ اور تفحص کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ

دیکھتا سب ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

مارگولیتھ نے مسند امام حنبلؒ کی چھ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا لیکن اس نے آنحضور ﷺ کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کتاب کذب، افتراء، تاویل اور تعصب کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ اس کا کمال یہ ہے کہ جس میں بُرائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا صرف اپنی طبّاعی کے زور سے بدنظر بنا دیتا ہے۔ یورپین مصنفوں کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ ان کا مذہبی

اور سیاسی تعصب ہے لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں۔ان کی وجہ سے ہم ان کو معذور سمجھتے ہیں۔سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام سرمایہ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں مثلاً مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت ابن اسحاق، تاریخ طبری وغیرہ ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو اسناد کے لحاظ سے بلند مرتبہ ہو۔آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بہ روایات صحیحہ منقول ہیں ۔دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصول تنقیح میں سخت اختلاف ہے۔یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو گردوپیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور نہیں اکھڑتا تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صحت تسلیم کر لی جائے گی۔[۲]

مستشرقین کے مطالعہ اسلام، اسلامی تہذیب وتمدن، اسلامی تاریخ اور سب سے بڑھ کر مطالعہ سیرت نبوی ﷺ کو ہم حالات وزمانہ کی رعایت سے کئی ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں پہلا دور اس وقت شروع ہوا جب بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی اسپین اور سسلی کی سرزمین پر عربوں نے قدم رکھا یہ صرف ایک ملک یا ایک جزیزہ کی فتح نہ تھی بلکہ تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کے ایک نئے اور انقلاب آفرین دور کا آغاز تھا۔ایسا دور جس نے بقول مشہور فرانسیسی مستشرق میسی نیون تہذیبی اعتبار سے یورپ کو بیدار کیا اور مغرب کی ترقی کے لئے نئے

امکانات پیدا کر دئے۔عربوں کے علوم کو حاصل کرنے،ان کے مذہب کی حقیقت کو سمجھنے اوران کی علمی سربلندی کا راز دریافت کرنے کا جذبہ اس بات کا محرک ہوا کہ اسلام کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے۔عربوں کی نئی تحقیقات، نئے علمی تجربات، نئے علمی رجحانات سے یورپ کے عالم استفادہ کرنا چاہتے تھے اور گو پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق جب گفتگو کرتے تو اپنے متعصّبانہ جذبات کو چھپا نہ پاتے تھے لیکن اسلام کے علمی ذخائر کے ذریعہ علمی سربلندی کا راز معلوم کرنے کی جستجو ان کے سارے جذبات پر حاوی تھی۔چنانچہ بارہویں صدی کے شروع سے ہی اسلامی فلسفیانہ کتب کو عبرانی،لاطینی اور دوسری زبانوں میں منتقل کیا جانے لگا اس دور میں ابن سینا اور رازی کی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ ہوا،اسی زمانہ میں یورپی ممالک خصوصاً انگلستان کے علماء اسپین کی عرب درسگاہوں میں تحصیل علم کے لئے آنے شروع ہوئے۔[۳]

دوسرا دور اس وقت شروع ہوا جب صلیبی محاربات کا آغاز ہوا۔اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کیلئے صلیبی جنگیں تقریباً پانچ سو سال تک جاری رہیں اور پانچ صدیوں میں وقفہ وقفہ سے یورپ کی مشترکہ عسکری قوت مسلم مشرق اوسط پر زندگی کے لئے موت اور آبادی کیلئے ویرانی کے دیو کی طرح منڈلاتی رہی۔پہلی جنگ ۱۰۹۹ء میں ہوئی اور آخری اور دسویں جنگ ۱۴۶۴ء میں پیش آئی۔پروفیسر سیّد حبیب الحق ندوی کے الفاظ میں ان صلیبی جنگوں اور خون آشامیوں کا تعلق

مستشرقین سے بڑا گہرا ہے کیونکہ پانچ صدیوں میں یورپ کے مفکرین، مولفین اور شعراء اسلام کے خلاف مسیحی جذبات کو گدگداتے، اسلام اور مسلمانوں کی تاراجی پر اُبھارتے اور ان کے اندر شہادت کا جذبہ پیدا کر کے آمادہ پیکار ہونے کی روح پھونکتے رہے۔ تمام صلیبی جنگوں میں یورپ کی مشترکہ عسکری قوت کا دیوالیہ نکل گیا۔ اسی شکست فاش کی بناء پر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف نفرت کی ایک نئی لہر دوڑ گئی، نثری ادب کے ساتھ شعری ادب بھی پوری قوت کے ساتھ میدان مبارزہ میں اتر آیا۔ شعراء نے اسلام کی تنقیص میں پوری قوت صرف کر دی۔ اس سلسلہ میں دانتے کا نام قابل ذکر ہے۔ [۴]

"مستشرقین کی علمی جدوجہد کے تیسرے دور کا آغاز اس وقت ہوا جب صنعتی انقلاب نے یورپی ممالک میں استعمار اور ملک گیری کی نئی خواہشات کو بیدار کر دیا۔ اب یورپین اقوام نے مسلمان ملکوں پر للچائی ہوئی نظریں ڈالنا شروع کر دیں۔ ان حالات میں اسلام کی طرف کھلا ہوا عناد سیاسی مصالح کے منافی نظر آنے لگا ان ملکوں پر اقتدار کے مضبوط پنجے جمانے کیلئے ضروری تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک ایک پیچ وخم، ان کے افکار واحساسات کی ایک ایک خلش اور اُن کے سماجی رجحانات اور دینی شعور کے ایک ایک نشیب وفراز کا پتہ لگایا جائے اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یورپین ممالک نے مختلف یونیورسٹیوں میں عربی پڑھانے کا بندوبست کیا اور اسلام کے علمی ذخائر کو جگہ جگہ سے سمیٹ کر مختلف

دانشگاہوں اور تحقیقی مراکز میں رکھا گیا۔ انڈونیشیا، ہندوستان، ایران، مصر، شام و عراق کے کتنے ہی انمول موتی جن کو غیر ملکوں میں دیکھ کر بقول اقبالؔ ''دل سی پارہ'' ہوتا ہے۔ یورپین کتب خانوں اور تحقیقی مراکز کی زینت بن گئے۔ اس زمانہ میں صلیبی دور کا کا کھلا ہوا معاندانہ انداز مصلحتاً ترک کر دیا گیا لیکن مقصد کے نشتر تیز تر ہو گئے۔ اب ساری جدوجہد کا رخ اسطرف تھا کہ مسلمانوں کو ذہنی طور مرعوب کر کے ایسے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا جائے کہ وہ ہر معاملہ میں ہدایت ورہبری کے لئے مغرب کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوں۔ تشکیک اور شبہات کے ذریعہ ان کے قوائے ذہنی کو مفلوج کر دیا جائے کہ وہ صحیح سمت میں قدم اٹھا سکیں نہ صحیح زوایۂ نگاہ سے چیزوں کا جائزہ لے سکیں۔ پوست پلائے ہوئے انسان کی طرح نہ اعضائے جسمانی ان کے قابو میں ہوں نہ قوائے ذہنی پر ان کا بس چلے۔ ۵

چوتھا دور اس وقت شروع ہوا جب اسلامی ممالک میں آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں مگر یورپ نے ذہنی طور پر غلام بنانے کے لئے برابر اپنے جال بچھائے۔ اسلام کے تئیں احترام کے جذبات کا اظہار کیا گیا اور رواداری کو عموماً برتا گیا۔

اس کے بعد ہی پٹرول کی دریافت نے پروفیسر نظامی کے بقول ''دنیا کا مرکز ثقل عرب ممالک کی طرف منتقل کر دیا''۔ مستشرقین کے حاشیہ خیال میں بھی

ایسی صورت نہ تھی۔اسلامی ممالک کی اقتصادی آزادی کے خیال نے انکے استعمارانہ فکر کے سارے منصوبے خاک میں ملادئے۔نئی صورت حال کے امکانات ان کے لئے تشویش بلکہ توحش کا باعث بنگئے۔اقتصادی اعتبار سے ان حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش برابر جاری ہے مستشرقین کی دلچسپی قرون اولیٰ کے اسلام کے بجائے جدید مذہبی تحریکات ،سماجی رجحانات اور اقتصادی امکانات کے مطالعہ کی طرف منتقل ہوچکی ہے اور فکرِ اسلامی کی توجیہ وتعلیل سے زیادہ مسلمان ملکوں کے اندرونی اور بیرونی حالات کا تجزیہ کی طرف ہے۔[۲]

موجودہ دور کے مستشرقین نے اگرچہ محمد ﷺ کی دینی حیثیت کو بعض کے سوا تسلیم تو نہیں کیا مگر آپ ﷺ کو ایک سماجی مصلح ،نیشنل ہیرو اور اسٹیٹسمین قرار دیا ہے۔

آٹھویں صدی سے لیکر آج تک مستشرقین حضرات نے جو تحریریں ہمارے سامنے پیش کی ہیں ان کا سرسری جائزہ بھی بتاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق مستشرقین کی بحث وتمحیص اور ان کا مطالعہ وتجربہ نہ معروضی وموضوعی ہے نہ تاریخی وعلمی بلکہ وہ سب وشتم کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس میں کلیسا کی دینی اور تقدس مآب شخصیتوں کے ساتھ ساتھ غیر دینی اور غیر مذہبی افراد بھی برابر حصہ لیتے رہے ہیں اور یہ سیلاب بلاخیز آج تک رواں ہے۔

طرزِ فکر،انداز بحث اور طریقہ تحقیق میں مستشرقین نے جو بنیادی غلطیاں

کی ہیں ان میں سے کچھ کی نشاندہی کرتے ہوئے عراقی فاضل عمادالدین خلیل رقم طراز ہیں کہ بعض اوقات مستشرقین ضعیف روایات کو لے کر انہی کی بنیاد پر اپنا فیصلہ صادر کر دیتے ہیں اور ان کی تقویت کے لئے شاذ وغریب حدیث کو پیش کرتے ہیں اور اسے مشہور ومستند روایات پر ترجیح دے دیتے ہیں خواہ وہ نقد وجرح کی کسوٹی پر کتنی ہی کھوٹی کیوں نہ ثابت ہو یہ لوگ ایسا قصداً اس لئے کرتے ہیں کہ یہی وہ واحد حربہ ہے جس سے وہ شکوک وشبہات کو ہوا دیتے ہیں۔

سیرت کے واقعات اور کارناموں کو عیسائی یا یہودی اصولوں کی دین سمجھتے ہیں۔ مستشرقین کی بڑی تعداد نصرانی اور مسیحی ہے اس لئے وہ اسلام کے محاسن کا اصل سہرا عیسائیت کے سر باندھتے ہیں اور جو مستشرقین یہودی ہیں وہ اسرائیل کے قیام اور صہیونیت کے تسلط کے بعد خاص طور پر اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر عربی اور اسلامی چیز کا سرا یہودیت سے ملا دیں۔

مستشرقین اپنے مطالعہ میں معکوس طریقہ ونہج اختیار کرتے ہیں اور نتائج کے استنباط میں بجائے عقل کے ذوق پر اعتماد کرتے ہیں۔ یہ لوگ بنیادی طور پر ایک غلط فکر کو مدنظر رکھ کر اپنا مطالعہ شروع کرتے ہیں اور پھر واقعات میں ایسی چیزوں کی تلاش کرتے ہیں جو ان کی رایوں کی کسی بھی درجہ میں تائید کرتی ہوں باقی باتوں کو وہ خارج از بحث قرار دیتے ہیں۔

مستشرقین نے سیرت اور تاریخ میں شکوک وشبہات پیدا کئے اور اپنے

ذوق وطبیعت اور مرضی سے ان کی نفی کی یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے اسمِ مبارک میں بھی شکوک پیدا کئے اور عجب کیا کہ اگر ان کے امکان میں ہوتا تو وہ رسول اللہ ﷺ کے وجود مبارک میں ہی شکوک پیدا کر دیتے۔ بہر حال سیرت رسول ﷺ سے متعلق صحیح تاریخ کی نسبت وہ جو چاہیں کہیں اس حقیقت سے وہ انکار نہیں کر سکتے کہ تمام انبیاء ورُسل میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت سب سے زیادہ واضح اور مفصل ہے۔ ۷

اعترافات:

رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ایسی ہمہ گیر، سحر کن انقلاب آفرین اور اثر انگیز تھی کہ مستشرقین حضرات اپنی بے جا اور متعصّبانہ تنقیص اور نا روا تمسیخ کے باوجود آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کے کسی نہ کسی گوشے سے ایسے مسحور و متاثر ہوئے کہ وہ اس کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان اعترافات کو اگر جمع کیا جائے تو ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے مگر ہم مشتے نمونہ از خردارے کے طور پر بہت ہی مختصراً چند ایک مستشرقین کے احساسات کو پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مائیکل ہارٹ:

''آپ ﷺ تاریخ کے تنہا شخص ہیں جو انتہائی حد تک کامیاب رہے۔ مذہبی سطح پر بھی اور دنیوی سطح پر بھی''۔ ۸

سر ولیم میور:

''پیغمبر نے بشپوں، پادریوں اور راہبوں کو یہ تحریر دی کہ ان کے گرجاؤں اور خانقاہوں میں ہر چھوٹی بڑی جیسی چیز تھی ویسی ہی برقرار رہے گی۔ خدا کے رسولؐ نے یہ عہد کیا کہ کوئی بشپ اپنے عہدے سے اور نہ کوئی راہب اپنی خانقاہ سے اور نہ کوئی پادری اپنے منصب سے برطرف کیا جائے گا اور نہ ان کے اختیارات، حقوق اور معمول میں کسی قسم کا تغیر کیا جائیگا جب وہ امن و صلح اور سچائی کے ساتھ رہیں ان پر جبر و تعدی نہ کی جائیگی نہ وہ کسی پر جبر و تعدی کریں''۔ ۹

لامارٹن:

''اگر مقصد کی عظمت، وسائل کی قلت اور حیرت انگیز نتائج! ان تین باتوں کو انسانی تعقل و تفکر کا میعار بلند مانا جائے تو کون ہے جو تاریخ کی کسی قدیم و جدید شخصیت کو محمد ﷺ کے مقابل لانے کی ہمت کر سکے۔ لوگوں کی شہرت ہوئی کہ انہوں نے فوجیں بناڈالیں، قوانین وضع کئے اور سلطنتیں قائم کرڈالیں لیکن غور طلب یہ ہے کہ انہوں نے حاصل کیا کیا؟ صرف مادی قوتوں کی جمع پونجی؟ وہ تو ان کی آنکھوں کے سامنے لٹ گئی۔ بس صرف یہی ایک آدمی ایسا ہے جس نے یہی نہیں کہ فوجوں کو مرتب کیا، قوانین وضع کئے اور مملکتیں، سلطنتیں قائم کیں بلکہ

اس کی نظر کیمیا اثر نے لاکھوں متنفس ایسے پیدا کر دئے جو اس وقت کی دنیا کی ایک تہائی آبادی پر مشتمل تھے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر انہوں نے قربان گاہوں کو، خداؤں کو، دین و مذہب کے پیروکاروں کو، خیالات و افکار کو، عقاید و نظریات کو بلکہ روحوں تک کو بدل ڈالا۔ پھر صرف ایک کتاب کی بنیاد پر جس کا لکھا ہوا ہر لفظ قانون تھا۔ ایک ایسی روحانی اُمت کی تشکیل کر دی گئی جس میں ہر زمانے، وطن، قومیت کا حامل فرد موجود تھا۔ وہ ہمارے سامنے مسلم قومیت کی ایک ناقابل فراموش خصوصیت یہ چھوڑ گئے کہ صرف ایک ان دیکھے خدا سے محبت اور ہر معبود سے نفرت''۔[۱۰]

باسورتھ اسمتھ :

''یہ صحیح ہے کہ تاریخ کی روشنی میں ہم حیات مسیحؑ کے کچھ واقعات دیکھ سکتے ہیں لیکن ان تیس سالوں سے کون پردہ اٹھا سکتا ہے جو انہوں نے (نبوت سے پہلے) گذارے۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں، اس نے اگرچہ دنیا کی معلومات میں کسی حد تک اضافہ کر دیا ہے اور آئیندہ مزید انکشافات متوقع ہیں، تاہم ایک مثالی زندگی، کون جانے، کتنی قریب ہے کتنی دور! کتنی ممکن ہے اور کتنی ناممکن! ہم ابھی بہت کچھ نہیں جانتے۔ ہم ان کی ماں کے بارے میں، انکی گھریلو زندگی کے بارے میں، ان کے ابتدائی دوست، احباب اور ان کے تعلقات باہم کے بارے

میں اور اس سلسلہ میں بھلا کیا جانتے ہیں کہ مسند نبوت پر وہ بتدریج فائز ہوئے یا وحی پا کر یک دم، خدائی مشن کے حامل بن گئے۔ بہر حال کتنے ہی سوال ایسے ہیں مگر وہ بس سوالات ہیں جواب کے بغیر! البتہ محمد ﷺ کے معاملہ میں صورت یکسر مختلف ہے۔ یہاں ہمارے پاس اندھیروں کے بجائے تاریخ کی روشنی ہے۔ ہم محمد ﷺ کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں جتنا کہ لوتھر اور ملٹن کے بارے میں۔ یہاں واقعات کا دامن، خیال محض، قیاس، تخمین وظن، ماورائے فطرت، روایات اور افسانہ وقسوں سے آلودہ ہونے کے بجائے، حقوق سے آراستہ ہے اور ہم بآسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ یہاں کوئی شخص نہ خود اپنے آپ کو دجل وفریب میں مبتلا کر سکتا ہے نہ دوسروں کو۔ یہاں ہر چیز دن کی پوری روشنی میں جگمگا رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی شخصیت کے بہت سے پرت ہیں اور ان میں سے ہر ایک تک ہماری رسائی ممکن نہیں ہے تاہم محمد ﷺ کی زندگی کے متعلق، ہم ہر چیز جانتے ہیں، اُن کی جوانی، ان کی اُٹھان، ان کے تعلقات، ان کی عادتیں، ابتدائی حالات اور پہلی وحی کے نازل ہونے تک کا لمحہ، ذہنی سفر اور ارتقاء وغیرہ، نیز ان کی داخلی، باطنی زندگی کے متعلق بھی اور یہ کہ جب اعلانِ نبوت کر چکے تو پھر ہم ایسی مکمل کتاب پاتے ہیں جو اپنی ابتداء، اپنی حفاظت اور متن وغیرہ کے کئی پہلوؤں کے لحاظ سے بالکل ممتاز ومنفرد ہے۔ اور اب تک ایسی کوئی معقول ومستند وجہ سامنے نہیں آئی جس کی بنیاد پر اس کتاب کے

خلاف کوئی شدید اعتراض کیا جا سکے''۔ ۱۱

میجر لیونارڈ:

''عظیم ۔۔ محض اسلئے ہیں کہ وہ ایک روحانی پیشوا تھے۔ انہوں نے ایک عظیم ملت کو جنم دیا اور ایک عظیم سلطنت قائم فرمائی۔ بلکہ سب سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک عظیم عقیدہ کا پرچار کیا۔ مزید برآں اس لئے بھی (عظیم تھے) کہ وہ اپنے آپ سے بھی مخلص و وفادار تھے، اپنے امتیوں سے بھی مخلص تھے اور اپنے اللہ سے بھی مخلص و وفادار تھے ان باتوں کو تسلیم کرتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلام ایک کامل، سچا مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں کو انسانیت کی تاریک گہرائیوں سے نکال کر نور و صداقت کی رفعتوں سے ہمکنار کرتا ہے'' ۱۲

تھامس کارلائل:

''پس وہ روشنی آ گئی عربوں کی تاریک روحوں کو منور کرنے کے لئے ایک ایسی تاریکی جو موت کی نقیب تھی چکا چوند پیدا کرنے والی روشنی، زندگی اور آسمانوں کا جاہ و جلال لئے ہوئے، اُس ؐ نے اُسے ''وحی'' کہا اور لانے والے فرشتہ کو جبرئیلؑ، اور ہم ابھی تک سوچ رہے کہ اسے کیا نام دیں؟ یہ خدائے ذوالجلال کی طرف سے اشارہ ہے ہمارے سمجھنے کے لئے۔ کسی چیز کی سچائی اور حقیقت جاننے کی کوشش، دراصل ایک روحانی عمل ہے جسکے بارے میں ہر منطق

اور قیاس ہوا میں تیر چلانے کے مترادف ہے۔ بقول نوانی ایک خدا پر اعتقاد کا اعلان، کیا ایک معجزہ سے کم تھا؟ کہ محمد ﷺ کا وجود کامل، جسم وروح اس حقیقت اور سچائی کے نور سے مستنیر تھا''۔[۱۳]

ارتھر گلمین:

''فتح مکہ کے اس موقع پر یہ بات ان کے حق میں جائیگی اور وہ قابل تعریف ٹھہریں گے کہ اس وقت جبکہ اہل مکہ کے ماضی کے انتہائی ظالمانہ سلوک پر انہیں جتنا بھی طیش آتا، کم تھا اور اُن کی آتش انتقام کو بھڑکانے کیلئے کافی تھا۔ مگر انہوں نے اپنے لشکر و سپاہ کو ہر قسم کے خون خرابے سے روکا اور اپنے اللہ کے سامنے انتہائی بندگی وعبدیت کا مظاہرہ کیا اور شکرانہ بجالائے۔ صرف دس بارہ آدمی ایسے تھے جنہیں پہلے سے ہی ان کے وحشیانہ روّیہ کی وجہ سے جلاوطن کر دیا گیا تھا اور ان میں سے صرف چار کو قتل کیا گیا لیکن دوسرے فاتحوں کے وحشیانہ افعال وحرکات کے مقابلہ میں اسے بہر حال انتہا درجہ کی شرافت اور انسانیت سے تعبیر کیا جائیگا (مثال کے طور پر صلیبیوں کے مظالم کو ۱۰۹۹ء میں فتح یروشلم کے موقع پر انہوں نے ستّر ہزار سے زاید مسلمان مرد، عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا یا وہ انگریز فوج جنہوں نے صلیب کے زیر سایہ لڑتے ہوئے ۱۸۷۴ء میں افریقہ کے سنہری ساحل پر ایک شہر کو نذر آتش کر ڈالا) محمد ﷺ کی

فتح درحقیقت دین کی فتح تھی۔سیاست کی فتح تھی۔انہوں نے ذاتی مفاد کی ہر علامت کو پس پست ڈالا اور کرّ وفر شاہی کے ہر نشان کو مسترد کر دیا اور جب قریش کے مغرور و متکبر سرداران کے سامنے سرنگوں ہو کر آئے تو محمد ﷺ نے اُن سے پوچھا کہ ''تمہیں مجھ سے کیا توقع ہے؟'' ''رحم، اے سخی و فیاض برادر! رحم'' وہ بولے ''جاؤ تم سب آزاد ہو'' انہوں نے فرمایا''۔[۱۴]

سٹینلے لین پول:

''اخلاق و عادات میں وہ حد درجہ سادہ تھے۔البتہ اپنے معمولات میں وہ بہت محتاط تھے۔ان کا کھانا پینا، ان کا لباس اور فرنیچر وغیرہ وہی معمولی درجہ کا تھا اور ہمیشہ وہی رہا جبکہ وہ اپنی طاقت وحکومت کی معراج تک پہنچے۔انہیں تخیل و تصور کی بے پناہ قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت ہوئی تھیں۔ان کا ذہن رسا تھا اور نازک سے نازک جذبات واحساسات کا پرتو قبول کر لیتا تھا۔کہا جاتا ہے کہ وہ پردے کے پیچھے بھی ایک کنواری سے زیادہ باحیا، عفت مآب اور شرمیلے تھے۔ اپنے چھوٹوں سے انتہائی رعایت کرتے اور یہ پسند نہ کرتے کہ ان کی کمزوریوں کو تلاش کر کے مذاق اڑایا جائے ان کے خادم انس کہتے ہیں کہ میں دس سال تک ان کی خدمت میں رہا لیکن انہوں نے کبھی اُف تک نہ کہا۔انہیں بچوں سے بہت محبت تھی وہ انہیں راستے میں روک لیتے اور ان کے سروں پر ہاتھ

پھیرتے ،انہوں نے زندگی میں کسی کو نہیں مارا۔اگر کسی کے بارے میں انتہائی برائی بیان کرتے تو بس اتنا کہتے کہ ''اسے کیا ہوگیا ہے؟اس کی پیشانی خاک آلودہ ہو'' جب اُن سے کسی کے بارے میں بددعا کرنے کی درخواست کی جاتی تو فرماتے ''میں تو انسانیت کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں'' وہ بیماروں کی عیادت کرتے ،کوئی جنازہ ملتا تو پیچھے چلتے ،غلام کی دعوت کو قبول کر لیتے۔اپنے کپڑوں کی مرمت خود کر لیتے ،بکریوں کا دودھ خود دوہ لیتے اور دوسروں کا ہمہ تن انتظار کر لیتے۔تھوڑا بہت کھانا جو کچھ بھی گھر میں موجود ہوتا،اس میں وہ لوگ ہمیشہ شریک ہوتے جو وہاں موجود ہوتے ،ان کے گھر کے باہر ایک چھپر (صفہ) تھا جہاں ایسے متعدد غریب افراد رہتے جن کی گذر بسر کا تمام تر انحصار انہی کی فیاضی پر منحصر تھا''۔۱۵

مانٹ گمری واٹ:

''محمد ﷺ پر کارلائل کے خطبات کے بعد سے مغرب کو یہ اچھی طرح معلوم ہوگیا ہے کہ محمد ﷺ کی سنجیدگی پر یقین کرنے کی معقول وجوہات موجود ہیں۔اپنے ایمان وعقیدہ کی خاطر مظالم سہنے کیلئے ہر وقت تیار رہنا،اُن پر اعتقاد رکھنے والوں کا اعلیٰ اخلاق و کردار،ان کی طرف امام و پیشوا کی حیثیت سے دیکھنا،پھر آخر کار ان کی عظمتیں اور کامیابیاں ،یہ سب دلیل ہیں ان کے اخلاص

کامل کی۔اس لئے محمد ﷺ کو ایک مدعی کاذب (Imposter) قرار دینے سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ اور پیدا ہو جاتے ہیں مزید برآں تاریخ کی کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے جسے مغرب میں اس قدر کم سراہا گیا ہو جتنا کہ محمد ﷺ کو۔اس لئے اگر ہم محمد کو کچھ بھی سمجھنے کی نیت رکھتے ہوں تو ضروری ہے کہ ہم محمد ﷺ کو اپنے مشن میں دیانت دار قرار دیں اور مقصد سے ان کے خلوص اور وابستگی کے قائل ہو جائیں اگر ہم اُن غلطیوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں جو اپنے ماضی سے ہم نے ورثہ میں پائی ہیں تو ہمیں ہر معاملہ میں ان کے خلوص اور دیانت کو بہر حال پیش نظر رکھنا ہوگا جب تک کہ کوئی الزام ان کے خلاف پوری طرح ثابت نہ ہو جائے''۔[۱۶]

ایڈوارڈ گبن:

''اسلام کے ذریعہ محمد ﷺ نے دس سال کے اندر ہی عربوں کی شدید ترین نفرتوں کو، انتقامی جذبات کو، نزاع و انتشار کو، رقابت و عداوت کو نکال پھینکا، لاقانونیت، عورتوں کی ذلت، سود خوری، شراب خوری، قتل و غارت گری، دُختر کشی کی رسومات قبیحہ کا استحصال کیا اور انسانی قربانیوں، سفیہانہ خیالات وتوہمات اور مادیت واشیاء پرستی سے نجات دلائی۔ پھر اسی مذہب کے ذریعہ آسمانوں کی اس بادشاہت کو انہوں نے عملاً اس زمین پر قائم کر دیا جسکی

بشارت بڑے ذوق وشوق سے جناب مسیحؑ نے دی تھی''۔ ۱۷

ایچ، جی، ویلز:

''یہ محمد ﷺ کی صدق کی دلیل قاطع ہے کہ ان سے قربت رکھنے والے لوگ۔ ان پر ایمان لائے حالانکہ وہی ان کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف تھے اور اگر انہیں ان کی صداقت میں ذرا برابر بھی شبہ ہوتا تو ان پر وہ ہرگز ایمان نہ لاتے''۔ ۱۸

ڈی، ایس، مارگولیتھ:

''محمد ﷺ کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا۔ آپؐ ایک سلطنت کی، جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر تھا، بنیاد ڈال چکے تھے۔ آپؐ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا۔ آپؐ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا''۔ ۱۹

مصادر

۱) اسلام اور مستشرقین، جلد سوم مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمان (اعظم گڈھ ۱۹۸۶ء)، ص ۱۸۲

۲) شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ، جلد اول، اعظم گڈھ، ص ص ۷۰۔۷۱

۳) اسلام اور مستشرقین، جلد دوم، ص ص ۱۱۔۱۲

۴) اسلام اور مستشرقین، جلد سوم، ص ص ۱۹۔۲۰

۵) پروفیسر نظامی کتاب مذکور، ص ۱۴۔۱۵

۷) اسلام اور مستشرقین، جلد دوم، ص ص ۱۵۴، ۱۶۱

۸) Dr.Michael H.Hart.The100,NewYork

بحوالہ 'پیغمبر انقلاب' از مولانا وحید الدین خان، ص ۷

۹) اسلام اور رواداری (دہلی ۱۹۸۶ء) از متین طارق باغپتی، ص ۵۸

۱۰) نقوش رسول نمبر (لاہور، پاکستان ۱۹۹۵ء) جلد یازدہم، ص ۵۴۱

۱۱۔۱۸) نقوش رسول نمبر، ص ص ۵۴۲، ۴۳۔۴۴، ۴۵۔۴۶، ۴۸۔۴۷

۱۹) سیرت النبیؐ، جلد ۴، ص ۳۹۹

سرورعالم ﷺ اور عالمی امن

لفظ ''اسلام'' کے معنی عیوب ونقائص سے پاک اور امن وسلامتی کے ہیں۔اسلامی معنی کے لحاظ سے امن وسلامتی سے مُراد وہ حقیقت ہے جو زمین میں کلمۃ اللہ کو قائم کر کے عام انسانوں کے لئے عدل وانصاف اور امن پھیلاتی ہے۔مولانا صدرالدین اصلاحی مرحوم کے الفاظ میں ''اسلام سے امن وسلامتی کا وہی تعلق ہے جو سورج سے روشنی اور گرمی کا۔خود اسلام کا لفظ بھی اس حقیقت کی منادی کرتا ہے جو سِلم یعنی سلامتی سے بنا ہے اس لئے امن وسلامتی تو اس کے خمیر میں شامل ہے''۔

قرآن کی رُو سے امن خدا کا بنی نوع انسان پر اتنا بڑا احسان ہے کہ وہ آدمی کو اس کا واسطہ دیتا اور اس کو جتلاتا ہے اور کہتا ہے ﴿فلیعبدوا رب هذا البیت الذی اطعمهم من جوع و اٰمنهم من خوف﴾ (ان پر اس گھر کے رب کی عبادت لازم ہے جس نے انہیں بھوک میں رزق دیا اور خوف سے امان دیا)۔اس آیت میں قرآن نے بڑے واضح الفاظ میں یہ اعلان بھی ضروری سمجھا کہ حضور سرور عالم ﷺ کی بعثت اور کتاب اللہ کے نزول سے اصل

مقصد یہ ہے کہ بنی نوع انسان پر سلامتی کی راہیں کھول دی جائیں۔قرآنی تعلیمات کے مطابق انبیاء ورسل کی بعثت کا ایک خاص مقصد دنیا میں قیام امن اور جان ومال اور آبرو کی حفاظت کا انتظام بھی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

﴿من اجل ذالک کتبنا علی بنی اسرائیل انه من قتل نفساً بغیر نفسٍ او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمعیا﴾ (المائدہ:۳۲)

(اس لئے ہم نے بنی اسرائیل کو لکھ دیا تھا کہ جس نے ایک جان کو بغیر بدلے یا زمین میں فساد کے قتل کیا اس نے گویا سارے عالم کو قتل کیا۔)

قرآن کے نزدیک سلامتی اور امن کے راستے ہی دراصل روشنی کے راستے اور صراط مستقیم ہیں۔ان کے سوا تمام وہ راستے جو بدامنی، بے چینی، فتنہ وفساد، ظلم وجور، زبردستی وزیادتی، خونریزی وسفاکی اور استحصال وغصب کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔اندھیروں اور ظلمتوں کے راستے ہیں اور اللہ کے نزدیک اندھیروں اور ظلمتوں کے راستے بنی نوع انسان کی گذرگاہ بننے کے قابل نہیں ہیں۔

سرور عالم ﷺ کی حیات طیبہ کے سرسری مطالعہ سے اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو امن وسلامتی کس قدر عزیز تھی۔ بعثت سے قبل بھی آپ ﷺ نے امن وسلامتی کے پیامبر ہونے کا ثبوت فراہم کردیا۔حلف الفضول کا واقعہ ہو یا کعبہ کی تعمیر جدید کا، آپ ﷺ کی امن پسندی کے واضح

ثبوت ہیں۔ ''اسلام کے دور اول میں اور اس کے ابتدائی تیرہ سال میں کئی ایسے ایشوز (Issues) تھے جو ٹکراو کا موضوع بن سکتے تھے مگر آپ ﷺ نے ہر ایسے اشو (Issue) سے اعراض کرتے ہوئے اپنے آپ کو پُر امن تبلیغ کے دائرہ میں محدود رکھا تھا اور دعوت کا کام پوری طاقت سے انجام دیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کے دائرہ میں ایسے بہترین افراد شامل ہوئے جنہوں نے اسلام کی تاریخ بنائی۔ مکہ میں جب وہاں کے سردار آپ ﷺ کے خلاف جنگ پر آمادہ ہوئے تو اس وقت بھی آپ ﷺ نے جوابی انداز اختیار کرنے کے بجائے یہ کیا کہ خاموشی کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔ ہجرت نے رسول ﷺ اور آپؐ کے ساتھ ہجرت کرنے والے تقریباً دوسو اہل ایمان کو یہ موقع دیا کہ وہ مدینہ پہنچ کر وہاں اسلام کا ایک طاقتور سینٹر قائم کریں''۔

سنہ چھ ہجری (۶ھ) میں حُدیبیہ کے مقام پر مشرکین مکہ اور سرور عالم ﷺ کے درمیان ایک دس سالہ ناجنگ معاہدہ ہوا۔ اس صلح نامے میں اکثر شرائط مسلمانوں کے خلاف تھیں اور اس موقع پر موجود سترہ سو مسلماں ایک شاق سے گذر رہے تھے۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے بڑے سکون وثبات سے اس صلح نامہ پر دستخط ثبت فرمائے اور اعلان کر دیا کہ ''میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، میں اس کے حکم کی نافرمانی نہیں کرونگا''۔ قرآن مجید نے محض اس معاہدہ کو فتح سے تعبیر کیا اور سورہ **انا فتحنا لک فتحاً مبینا** نازل ہوئی۔ نتائج کے اعتبار سے یہ

صلح درحقیقت فتح کا دیباچہ تھی۔قدیم ترین سیرت نگار ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ حدیبیہ سے قبل کی کوئی فتح مسلمانوں کے لئے اتنی بڑی ثابت نہیں ہوئی جتنی صلح حدیبیہ کی فتح ثابت ہوئی۔اس سے قبل لوگ جب بھی ملتے تھے تو میدان جنگ میں ہی ملتے تھے مگر اس صلح نامے کے بعد دونوں میں میل جول اور آمد و رفت شروع ہوئی۔ ہر مسلمان اسلام کی سچی تصویر تھا۔اس تصویر کو دیکھ کر اور تبادلہ خیالات سے کُفار کے دل خود بخود اسلام کی طرف کھینچنے لگے اور اسلام نہایت سُرعت کے ساتھ پھیلنے لگا۔ چنانچہ مسلمان افواج کی تعداد جو اس صلح سے پہلے تین ہزار سے زاید کبھی نہ تھی وہ محض دو سال کے اندر فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار ہوگئی۔

انسانی معاشرہ میں امن قائم کرنے کے لئے رواداری کو غیر معمولی اہمیت ہے۔''یعنی جن لوگوں کے عقاید ہمارے نزدیک غلط ہیں ان کو ہم برداشت کریں اور ان کے جذبات کا لحاظ کر کے ان پر ایسی نکتہ چینی نہ کریں جو ان کو رنج پہنچانے والی ہو نیز انہیں ان کے اعتقادات سے پھیرنے یا ان کے عمل سے روکنے کے لئے زبردستی کا طریقہ اختیار نہ کریں بلکہ روزمرہ کے معاملات میں وسیع القلبی کا ثبوت دیں''۔جبکہ تنگ نظری اور تعصب فتنہ و فساد اور انتشار و بگاڑ کی سب سے بڑی وجہ ہے۔رواداری اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ہے اور باہمی حسد، طبقاتی جنگ، قومی پیکار اور مذہبی تعصب سے انسان کو نجات دلا کر

دنیا میں امن قائم کرسکتی ہے۔سرور عالم ﷺ نے رواداری پر اس قدر زور دیا کہ اس سے رُوگردانی کرنے والے کو اپنی جماعت سے خارج قرار دیا۔

''آپ ﷺ نے مملکت کے تمام مسلم و غیر مسلم باشندوں کو رنگ و نسل، وطن یا دنیوی حیثیت کے بغیر وہ تمام بنیادی حقوق دئے جو قرآن میں مخصوص ہیں مثلاً جان و مال، عزت و آبرو اور نجی زندگی کا تحفظ، مذہبی دل آزاری سے تحفظ، عبادت گاہوں کا تحفظ، عقیدہ کی آزادی کا تحفظ، ظلم کے خلاف احتجاج کا حق، آزادی اظہار رائے کا حق، معذوروں اور کمزوروں کا حق، مساوات کا حق، معاشی تحفظ کا حق۔

یہ حقوق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء نا قابل تغیر اور قطعی غیر منفک (Inalienable) ہیں، ان میں کسی حال میں ترمیم و تنسیخ نہیں کی جا سکتی اور نہ انہیں معطل کیا جاسکتا ہے''

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی اپنی معرکتہ الآراء کتاب ''عصری اور اسلامی تصور امن'' میں اسلام کے تصور امن و سلامتی پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ''اسلام بنیادی طور پر امن وسلامتی کا خواہاں ہے اور اسے وہ بہر صورت عدل و مساوات کے ذریعہ مستقل طور پر قائم و دائم رکھنا چاہتا ہے یہی اسکی ابتداء ہے اور یہی انتہا بھی۔ جب وہ دعوت امن وسلام کی تبلیغ سے اپنے مشن کا آغاز کرتا ہے۔تب بھی جب اسکے سامنے اولیت امن کو حاصل ہوئی ہے اور جب حکومت

کی زمام کار اس کے ہاتھ میں آجاتی ہے تب بھی وہ امن وسلامتی کو اپنی اولین ترجیح قرار دیتا ہے''۔

اسلام کے سوا دنیا میں جو بھی نظام آگیا اس سے دنیا میں امن وامان قائم ہوا ہے نہ ہوگا۔ایک طرف کمیونزم نے پون صدی تک دنیا پر بدترین قسم کی ڈکٹیٹرشپ مسلّط کردی دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام کا داعی کس طرح مساوات، امن، جمہوریت اور حقوق بشر کے نام پر امن عالم کو تہہ وبالا کررہا ہے وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔کمزور ممالک کو جس طرح تاراج کیا جارہا ہے، مرد وخواتین اور نہتے بچوں کو جس بے دردی سے تہہ تیغ کیا جارہا ہے، قیدیوں کے ساتھ جو بے عزتی، بربریت اور وحشیانہ سلوک روا رکھا جارہا ہے اس پر ساری انسانیت شرم سار ہے۔مظلوموں کو دہشت گرد قرار دینے والے خود بدترین قسم کے دہشت گرد، خونخوار اور وحشی درندوں سے بدتر ثابت ہورہے ہیں۔

اس کے برعکس ذرا چودہ سال قبل سرور عالم ﷺ کے دورِ رحمت ونور پر ایک نگاہ دوڑایئے۔جنگ بدر میں مسلمانوں کو اللہ کے فضل سے مُشرکین عرب پر فتح نصیب ہوئی، (۷۰) ستر کافروں کو قیدی بنایا گیا۔ان کو رسیوں سے کسا گیا، کسی قیدی کے کراہنے کی آواز رسول رحمت ﷺ کے گوش مبارک میں پہنچی، آپ ﷺ تڑپ اٹھے۔رسیوں کو فوراً ڈھیلا کردیا گیا۔قیدیوں کو تقسیم کرکے مسلمانوں کے گھروں میں منتقل کیا گیا اور صحابہ کرامؓ کو حکم دیا گیا کہ وہ

قیدیوں کی بہترین طریقے سے خاطر مدارات کریں۔ صحابہ کرامؓ خود کھجوروں پر گذارا کرتے تھے اور قیدیوں کو روٹی فراہم کرتے تھے۔

فتح مکہ کے موقع پر سرور عالم ﷺ نے اپنے بدترین قسم کے دشمنوں کو معاف کر کے ایسی مثال قائم کی جس کی نظیر رہتی دنیا تک نہیں مل پائیگی۔ نعیم صدیقی نے اپنی شاہکار تصنیف ''محسنِ انسانیت'' میں کیا خوب لکھا ہے کہ کوئی اور ہوتا تو آج اکڑ کر مکے میں داخل ہوا ہوتا۔ ایک ایک واقعہ کا انتقام لیتا، چُن چُن کے اُن افراد کو تلوار کا لُقمہ بناتا جنہوں نے ذرا بھی کوئی زیادتی کی ہوتی، مفتوح شہر میں قتل عام کرا دیتا، لوگوں کے مال اور عورتوں کی عصمتیں نیلام پر چڑھ گئی ہوتیں لیکن فاتح مکہ چونکہ محسنِ انسانیت ﷺ تھا اسی لئے اس نے زمین پر قبضہ کرنے کے ساتھ انسانون کو فتح کرنا چاہا اور جسموں پر قابو پانے سے بڑھ کر دلوں کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ مہاجرین سے کہا کہ ''وہ اپنے اپنے مکانوں اور املاک سے دست بردار ہو جائیں''۔

غزوہ حُنین میں چھ ہزار قیدی ہاتھ آئے، کچھ مدت کے بعد ہی ان کو رہا کر دیا گیا اور جاتے وقت رسولِ رحمت ﷺ نے ہر ایک کو مصر کے قُبطی کپڑے مرحمت فرمائے۔

آپ ﷺ کے خلیفہ راشد حضرت ابوبکر صدیقؓ فوجیوں کو روانہ کرتے وقت نہایت سختی سے تاکید فرماتے کہ ''عورتیں، بچے، بوڑھے قتل نہ کئے جائے۔

راہبوں اور عابدوں کو ستایا جائے نہ ان کی عبادت گاہوں کو مسمار کیا جائے۔ کوئی پھل دار درخت کاٹا جائے نہ کھتیاں جلا دی جائیں۔ آبادیاں ویران نہ کی جائیں۔ جانوروں کو ہلاک نہ کیا جائے۔ بدعہدی سے پرہیز کیا جائے۔ صلح کے لئے کوئی ہاتھ بڑھائے تو فوراً اس پیش کش کو قبول کیا جائے۔ ناقوس بجانے کی ممانعت نہیں ہوگی اور نہ تہوار کے موقعہ پر صلیب نکالنے سے روکے جائیں''۔ یہی معمول باقی خلفائے راشدینؓ کا بھی تھا۔[1]

آج دنیا امن و امان کے لئے ترستی ہے۔ اسے کہیں اماں میسّر نہیں، عزت و آبرو اور امن و امان تو صرف رسول رحمت ﷺ کے دامن سے وابستہ ہے۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں تو کہاں ملی
مرے جُرم خانہ خراب کو تیرے عفوِ بندہ نواز میں

---

[1] ان ہدایات کے متعلق مشہور انگریز مصنف باسورتھ اِسمتھ اپنی تصنیف Islam and Civilization کے صفحہ ۷۵ پر لکھتے ہیں کہ ان کریمانہ اصولوں نے مسلمانوں کی ساری جنگی تاریخ میں جنگی ضوابط کا کام دیا۔ Greece under the Romans کے مصنف Finlay نے لکھا ہے ''اسلام نے یہودیوں اور عیسائیوں کو انصاف اور حلم و بُردباری کے ایسے اصولوں کا مژدہ سنایا جن پر نہ تو رومی شہنشاہوں اور نہ سخت عقیدہ پادریوں اور پوپوں نے کبھی عمل کیا تھا'' (ص ۳۶۷)

حضرت شاہ ہمدانؒ اور کشمیر

وادی کشمیر میں تحریکی انداز میں اسلام حضرت شاہ ہمدان میر سیّد علی الہمدانیؒ کی مبارک کوششوں سے داخل ہوا۔ چودھویں صدی عیسوی کے اس عظیم مبلغ و مصلح نے کشمیر کی کایا ہی پلٹ کے رکھ دی۔ یہاں کے دین و مذہب، تہذیب وتمدن، صنعت وحرفت اور علم وفضل میں ایک تاریخ ساز اور انقلاب انگیز تبدیلی کا آغاز ہوا۔ [1]

شاہ ہمدانؒ کی خدمات کی اہمیت اور عظمت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم اس دور کے ہندو سماج، تہذیب وتمدن، اخلاقی اور مذہبی صورت حال کا جائزہ لیں۔ دور جدید کے کشمیری ہندو مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام کے داخل ہونے سے قبل کشمیر سیاسی بے چینی، اخلاقی بے راہ روی، اقتصادی بدحالی اور کھوکھلی مذہبیت کی لعنتوں میں گرفتار ہو چکا تھا۔ پروفیسر این۔ کے۔ زتشی نے کلہن اور جون راج کے حوالے سے اس وقت کے سیاسی، سماجی اخلاقی اور اقتصادی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے: ''کشمیر میں اسلام کے داخل ہونے سے قبل تین سو سالہ ہندو دور حکومت دہشت اور مایوسی کا

دور ہے۔زوال عام نے اپنی علامتیں گیارہویں صدی عیسوی سے ہی دکھانا شروع کردی تھیں جب سنگرامہ راجہ نے لُہر اخاندان کے بانی کی حیثیت سے اپنے آپ کو کشمیر پر مسلّط کردیا۔انحطاط کا عمل سماجی، اقتصادی، سیاسی غرض ہر میدان مین دکھائی دے رہا تھا۔ جیاسمہا (جو کہ آخری ہندو عبقری بادشاہ تھا) کے بعد ہندو راج تیزی سے روبہ زوال ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ۱۳۲۰ء میں ابتری کی حالت میں ختم ہوگیا۔[۲]

دور آخر میں کشمیر کے بادشاہ عموماً کمزور، نا اہل، بے وقوف اور کٹھ پتلی تھے وہ طاقتور وزیروں اور جاگیرداروں کے ہاتھوں میں کھلونے بن گئے تھے۔تفرقہ انگیز قوتوں نے سر اٹھایا اور شاہی نزاعوں، سازشوں اور خونین جنگوں نے ملک نکو ابتری اور افراتفری کے گہرے سمندر میں پھینک دیا۔ کشمیر لٹیرے وزیروں اور جاگیرداروں کی ملک بن گیا تھا۔ان حالات میں امن وامان کو مشکل ہی سے قائم کیا جاسکتا تھا۔لوگوں کا جان و مال غیر محفوظ تھا۔لوگ غارت گر سرکاری افسروں اور وزیروں کے غیر انسانی مظالم اور اقتصادی استحصال کے شکار ہوگئے تھے۔ان لوگوں نے قومی جائداد میں غبن کیا۔مندروں کی دولت کو لوٹ لیا اور لوگوں سے نقد و جنس چھین لئے۔ عوام بھاری ٹیکسوں تلے کراہتے رہے۔ بار بار کی بغاوتوں اور خانہ جنگیوں نے اندرونی تجارت میں خلل ڈالا اور ایسے بھی مواقع آئے جب بیرونی تجارت بالکل ٹھپ ہوکر رہ گئی تاجروں کا طبقہ لالچی اور

بد دیانت تھا۔ زوال پذیر ذرائع آمدنی اور بادشاہوں کی عیاشیوں نے کشمیر کے قومی خزانوں کو خالی کر دیا۔ راجا انتا (۱۰۲۸ء۔ ۱۰۶۲ء) اس حد تک مقروض ہو گیا تھا کہ اسے اپنا تاج و تخت ایک بیرونی تاجر کو گرو رکھنا پڑا ان میں سے بعض اس قدر بے لگام اور شہوت پرست تھے کہ قریب ترین رشتہ دار بھی ان کی شہوت رانی کی زد میں رہتے تھے۔[۲]

شاہ ہمدان کا نام نامی علی تھا۔ ان کے سال ولادت کے بارے میں تذکرہ نگاروں اور مورخوں کے درمیان اختلاف ہے۔ نزہتہ الخواطر[۳] بروکلمان[۴] شیر[۵]، تحائف الابرار[۶]، تذکرہ علمائے ہند[۷]۔ قاموس الاعلام[۸]، دایرہ معارف الاسلامیہ[۹] میں ان کا سال ولادت ۷۱۴ھ بمطابق ۱۳۱۴ء درج ہے۔ اسی کو پروفیسر محمد ریاض[۱۰]، پروفیسر محبّ الحسن[۱۱]، پروفیسر رفیقی[۱۲]، ڈاکٹر پارمو[۱۳] اور بامزے[۱۴] نے بھی قبول کیا ہے۔ مگر صاحب ''خلاصتہ المناقب'' نے لکھا ہے کہ حضرت شاہ ہمدانؒ کی وفات ۷۸۶ھ میں ہوئی اور اس وقت آپ کی عمر تہتر برس تھی[۱۵]۔ اس لحاظ سے آپ کا سال ولادت ۷۱۳ھ ہی بنتا ہے جو ڈاکٹر سیدہ اشرف ظفر کے خیال میں قرین صواب ہے۔[۱۶] مولانا جعفر بدخشی شاہ ہمدانؒ کے نامور مرید رہے ہیں اور ان کی خلاصتہ المناقب اس سلسلے میں اہم ترین اور قدیم ترین ماخذ ہے لہٰذا ان کا بیان زیادہ قابل اعتماد معلوم ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ شاہ ہمدان کی ولادت ۷۱۳ھ مطابق ۱۳۱۳ء میں ہوئی۔

شاہ ہمدانؒ کے والد محترم شہاب الدین علوی سید تھے۔آپ ہمدان کے حاکم تھے۔۱۷ لگتا ہے کہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے وہ شاہ ہمدانؒ کی تعلیم وتربیت خود نہیں کر پاتے تھے اس لئے شاہ ہمدانؒ اپنے ماموں اور وقت کے مشہور و معروف صوفی سید علاء الدین سے منسلک ہو گئے ۱۸۔ان ہی کی آغوش تربیت میں شاہ ہمدانؒ نے ابتدائی تعلیم وتربیت کے علاوہ قرآن مجید حفظ کیا۱۹۔بارہ سال تک اپنے ماموں کے زیر تربیت رہے اس کے بعد سلوک وطریقت کی تعلیم و تربیت شیخ محمود مزدقانی اور تقی الدین علی دوستی سے حاصل کی ۲۰۔اس کے علاوہ بعض روایات کے مطابق سید علاء الدّولہ سمنانی سے بھی کسب فیض کیا۲۱۔علی دوستی اور محمود مزدقانی کے یہاں شاہ ہمدانؒ کو برسوں کسر نفسی، ضبط نفس، تزکیہ قلب اور تصفیہ باطن کی کڑی اور صبر آزما مشقتوں سے گزرنا پڑا جب جا کے انھوں نے آسمان سلوک پر وہ تابندگی حاصل کی جس نے ایک عالم کو منور کر دیا۔

اپنے استاذ شیخ محمود مزدقانی کی ہدایت پر آپ نے تین بار ربع مسکون کے ممالک کی سیاحت کی۔ہر سفر سات سال میں مکمل ہوتا تھا اس طرح انھوں نے اپنی عمر عزیز کے اکیس سال سفر میں گذارے اور بارہ دفعہ حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے ۲۲۔ان اسفار کا مقصد مقربان خدا سے استفادہ اور دین حق کی تبلیغ واشاعت ہوتا تھا۔انہی اسفار میں آپ نے چودہ سو غیر معروف اور گمنام اولیاء اللہ کو دریافت کیا۲۳۔ان گمنام اولیاء اللہ کے علاوہ ہزاروں

مقربان رب سے ملاقاتیں کیں۔ ہزاروں لوگوں کو اسلام کے آفاقی نظام سے بہرہ ور کیا۔ان اسفار میں آپ نے مزدقان، ختلان، بلخ، بدخشاں، ختا، یزد، شام، بغداد، روم، ماوراء النہر، بیت المقدس، سیلون، ایلاق، جبل الفتح، جزیرہ صحف، جبل لبنان، جبل القدوم، گاذرون، جبل الابواب اور کشمیر کی سیاحت کی[۲۴]۔

شاہ ہمدان کے اسفار میں کشمیر کی سیاحت نتائج کے اعتبار سے اہم ترین سیاحت مانی جاتی ہے مگر اس سفر کے پس منظر اور محرکات پر بے حقیقت کہانیوں کی تہہ در تہہ گرد جم گئی ہے اور یہ بات قدیم وجدید مورخوں اور تذکرہ نگاروں میں عام طور پر مشہور ہوگئی ہے کہ شاہ ہمدانؒ امیر تیمور کی تہدید کے نتیجے میں کشمیر کی وادی میں وارد ہوئے۔ چنانچہ مرزا اکمل الدین محمد کامل بدخشی کشمیری (م ۱۱۳۱ھ) نے لکھا ہے

گر نہ تیمور شور و شر کر دی
گے امیر این طرف گزر کردی[۲۵]

اسی کو محمد اعظم دیدہ مری[۲۶]، حسن کہویہامی[۲۷]، حاجی حسین تبریزی[۲۸]، حاجی محی الدین مسکین[۲۹]، بروکلمان[۳۰]، طامس بیل[۳۱]، ایس۔ایم۔اسٹرن[۳۲]، مولانا عبد الحی[۳۳]، علی اصغر حکمت[۳۴]، پروفیسر محبّ الحسن[۳۵]، پروفیسر محمد

ریاض ۳۶، ڈاکٹر پارمو ۳۷، بامزے ۳۸، اور ڈاکٹر سیدہ اشرف ظفر ۳۹ نے بھی قبول کیا ہے۔

مگر حالات و واقعات کا تجزیہ کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ امیر تیمور اور شاہ ہمدانؒ کے درمیان مخاصمت یا کدورت کی کہانی محض سخن طرازی ہے۔ تیمور بقول یزدی ۷۸۸ھ یا ۷۸۹ھ میں ایران و عراق کی تسخیر کی طرف متوجہ ہوا ۴۰ جبکہ شاہ ہمدانؒ ۷۸۶ھ میں انتقال کرتے ہیں، لہٰذا امیر تیمور کی تہدید کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے؟

پروفیسر رفیقی نے اس افسانہ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کبرویہ سلسلہ کے صوفیا مسلم ممالک میں دور دور تک جاتے تھے۔ خاص طور پر علاء الدولہ سمنانی کے پیروکاروں نے اسلامی تبلیغی سرگرمیوں میں زبردست دلچسپی اور سرگرمی دکھائی۔ صرف سید علی ہمدانی اور ان کے رفقاء ہی نے وطن کو نہیں چھوڑا۔ خانقاہ سمنانیہ کے فیض یافتہ دوسرے صوفیاء جنوبی ہند کے شہر گلبرگہ تک پہنچ گئے۔ میر سید اشرف جہانگیر سمنانی (م ۱۴۰۵ء) جو کچھ دیر تک سید علی ہمدانیؒ کے بھی ہم رکاب تھے لکھنو کے نزدیک شہر فیض آباد کے گاؤں کچوچہ میں سکونت پزیر ہو گئے تھے ۴۱۔ اس بات کی وافر شہادت دستیاب ہے کہ تیمور سادات کا مخالف نہیں تھا اور اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے سید علی ہمدانیؒ اور ان کے ساتھیوں کو کشمیر جانے پر مجبور کیا ہو۔ اصل میں کشمیر میں نئی نئی ہی مسلم حکومت قائم ہو گئی تھی اور تبلیغ

واشاعت اسلام کے لیے مناسب حالات پیدا ہو گئے تھے اس لیے سید علی ہمدانیؒ نے کشمیر کا رُخ کیا ہوگا۔ مزید برآں سید علی ہمدانیؒ اکیلے کشمیر نہیں گئے تھے۔ ان کے ساتھ لوگوں کی ایک بڑی تعداد بھی تھی، جن میں کے سب علوی سادات ہی نہیں تھے۔ علاوہ ازیں سید علی ہمدانیؒ نے برسوں پہلے سید تاج الدین اور سید حسین کو کشمیر کے حالات سے جانکاری حاصل کرنے کے لیے کشمیر بھیجا تھا۴۲۔

پروفیسر رفیقی کے خیالات کی تائید تیمور کے اس بیان سے ہوتی ہے جو ملفوظات تیموری میں موجود ہے۔ چنانچہ تیمور لکھتا ہے ''میں نے حکم دیا کہ تمام اہم مواقع پر سادات اور اہل علم میرے دائیں طرف بیٹھے ہوئے ہونے چاہئیں۔ میں نے اس بات کا بھی خیال رکھا کہ سادات کی کبھی بھی توہین نہ کی جائے اور نہ ان کو برا بھلا کہا جائے اور میں نے ان کے مقید کرنے اور قتل کرنے سے منع کیا۴۳۔ ظفر نامہ کے ان ابیات سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

ندیدی کس از خویش واز اجنبی
گرامی تر از اہل بیت نبیؐ
بجان معتقد بود سادات را
ہماں اہل تقویٰ و طاعات را ۴۴

اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شاہ ہمدانؒ کے ذریعہ کشمیر کی تقدیر بدل دینا چاہی جوانھوں نے بدل کر رکھ دی۔ قدیم تذکروں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کشمیر کے سفر پر شاہ ہمدانؒ ایک غیبی اشارہ پر روانہ ہوئے تھے۔ ملا حیدر بدخشی نے منقبتہ الجواہر میں قوام الدین بدخشی اور خواجہ اسحاق ختلانی سے روایت کی ہے کہ'' جناب سیادت رو بقبلہ بیٹھے تھے کہ سرور کائنات وفخر موجودات ﷺ جلوہ گر ہوئے، فرمایا'' میرے بیٹے کشمیر جا اور وہاں کے لوگوں کو مسلمان بنا اگر چہ وہاں کچھ لوگ شرف اسلام سے مشرف ہوئے ہیں لیکن کافروں اور مشرکوں سے بدتر ہیں۔ احکام اسلام نہیں جانتے اور کفر و اسلام میں امتیاز نہیں کرتے''۔ اس کے بعد جناب سیادت کشمیر روانہ ہوئے''۴۵۔ اس بیان سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ شاہ ہمدانؒ تیمور کے خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ ارشاد رسولؐ کے تحت کشمیر میں وارد ہوئے تھے۔

شاہ ہمدانؒ کشمیر میں کب اور کتنی بار تشریف لائے اس بارے میں مورخین اور تذکرہ نگاروں کے درمیان خاصا اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ شاہ ہمدانؒ کے قریب العہد مورخ اور تذکرہ نگاران کی ایک ہی سیاحت کشمیر کے قائل ہیں ان کے نزدیک یہ سیاحت سلطان قطب الدین (۱۳۷۳ء۔ ۱۳۸۹ء) کے دور حکومت مین عمل میں آئی ہے۔ مرزا حیدر نے تاریخ رشیدی میں کشمیر میں شاہ ہمدانؒ کی ایک سیاحت کا ذکر کیا ہے۴۶۔ ابوالفضل نے بھی آئین

اکبری میں ایک ہی سیاحت کا ذکر کیا ہے[۴۶]۔ سید علی[۴۷] ’‘ ، بہارستان شاہی[۴۸]، حیدر ملک چاڈورہ[۴۹] بھی ایک ہی سیاحت کے قائل ہیں۔ امیر احمد رازی ’’ہفت اقلیم‘‘ میں حضرت شاہ ہمدانؒ کی ایک ہی تشریف آوری کا ذکر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ سید نے چالیس روز وادی میں قیام فرمایا۔ محمد اعظم[۵۰]، حسن کھویہامی[۵۱] اور مسکین[۵۲] تین سیاحتوں کے قائل ہیں اور اسی رائے کو ایم، ڈی، صوفی[۵۳]، پروفیسر محمد ریاض[۵۴]، پروفیسر محب الحسن[۵۵]، ڈاکٹر فاروق بخاری[۵۶]، ڈاکٹر سیدہ اشرف ظفر[۵۷] اور بامزے[۵۸] اور پروفیسر شمس الدین احمد نے بھی قبول کیا ہے۔

شاہ ہمدانؒ کے سال قدوم پر بھی مورخین اور تذکرہ نگار متفق نہیں ہیں۔ سید علی نے اپنی تاریخ کشمیر میں آمد شاہ ہمدانؒ کا سال ~~۷۸۶~~ھ دیا ہے[۵۹] اور ساتھ ہی خاوری کا یہ قطعہ تاریخ بھی لکھا ہے۔

میر سیدعلی شہ ہمدان
سیر اقلیم سبعہ کردہ نکو
شد مشرف ز مقدمش کشمیر
اہل آں شہرازوے ہدایت جو
سال تاریخ مقدم اورا
گفت از مقدم شریف بجو[۶۰]

جس سے ۷۸۵ھ مستفاد ہوتا ہے۔ گمان یہی ہے کہ سید علی بھی ۷۸۵ھ ہی کے قائل تھے اسی لیے ''مقدم شریف بجو'' کا قطعہ دیا ہے۔ ۷۸۶ھ کو کاتب کی غلطی پر محمول کرنا چاہیئے کیونکہ ''مقدم شریف بجو'' سے کسی بھی صورت میں ۷۸۶ھ نہیں بنتا ہے۔ صاحب بہارستان شاہی نے ۷۸۳ھ کا سن دیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ بعض کے خیال میں شاہ ہمدان ۷۷۳ھ میں کشمیر میں داخل ہوئے۔ ۶۱ مورخ حسن جو تین سیاحتوں کے قائل ہیں لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ ہمدان ۷۷۴ھ، ۷۸۱ھ اور ۷۸۵ھ میں کشمیر میں تشریف لائے۔ ۶۲ حاجی محی الدین مسکین نے بھی انہی تین سنین کو قبول کیا ہے اگر چہ تیسری سیاحت کا سن ۷۷۵ھ دیا ہے۔ ۶۳ جو کاتب کی غلطی معلوم ہوتا ہے کیونکہ دوسری سیاحت کا سن مسکین نے ۷۸۱ھ دیا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ ایم۔ ڈی۔ صوفی پروفیسر محمد ریاض، پروفیسر محبّ الحسن، ڈاکٹر سید فاروق بخاری اور ڈاکٹر سیدہ اشرف ظفر بھی ان ہی تین سیاحتوں کے قائل ہیں۔ ڈاکٹر آر۔ کے پارمو ۷۸۱ھ والی سیاحت کے قائل ہیں اور لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ ہمدان نے یہاں چھ سال تک قیام کیا۔ ۶۴ پروفیسر رفیقی ۷۸۳ھ والی ایک سیاحت کے قائل ہیں۔ ۶۵

جناب غلام رسول بٹ کا خیال ہے کہ شاہ ہمدان کشمیر میں ۷۸۵ھ میں سلطان قطب الدین کے زمانے میں تشریف لائے۔ منقبۃ الجواہر سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ حیدر بدخشی رقم طراز ہیں کہ ''جب جناب سیادت

کا قدم اس ملک پر پڑا، پہنچتے ہی بادشاہ آکر مرید ہوا۔ سلطان قطب الدین نے کشمیر میں تاریخ ورود اس طرح کہی۔

چوں آمدآں شہ ملک ولایت
گرفت کشمیراز اسلام رایت
بگفتنداز کہ یا فتہ تربیت ایں
ازاں گفتم کہ ازاں شاہ ہدایت[۶۶]

''ازاں شاہ ہدایت'' سے ۷۸۵ھ مستفاد ہوتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس سے پہلے شاہ ہمدان کشمیر تشریف لائے ہوتے تو سلطان قطب الدین بھی اسی وقت مرید ہوگئے ہوتے۔ کتب تواریخ میں مذکور ہے کہ جب شاہ ہمدان کشمیر تشریف لائے تو اس وقت سلطان شہاب الدین محاذ جنگ پر تھا اور قطب الدین نے ان کا استقبال کیا[۶۷]۔ اگر اس بیان کو صحیح مان لیا جائے تو قطب الدین اسی وقت مرید بھی ہوگئے ہوتے پھر ۷۸۵ھ میں مرید ہونے اور تاریخ قدوم لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سید محمد خاوری کے قطعہ تاریخ قدوم سے بھی اس خیال کی تصدیق وتائید ہوتی ہے[۶۸]۔

سلطان قطب الدین اور ان کے وزرا شاہ ہمدان اور ان کے رفقاء کو

عزت واحترام کے ساتھ شہر لائے۔ اس موقع پر بادشاہ نے اپنے احساسات کا اظہار یوں کیا۔

جانم فدائے برقدم خاک تو بادا یا امیر
رُوحم فدائے برشرف نام تو بادایا امیر
از آمد نت مشرف بہ اسلام گشتہ ام
چشم فدائے برآمدن تو باد ایا امیر
خواہم زِ روزِ حشر شفاعت کُنی مرا
ہر چار عنصر فدائے اِسم تو بادا یا امیر
قطبی اگر چہ کرد گُناہاں زحدوعد
آخر مرانصیب شفاعت تو بادا یا امیر ۶۸؎

سرینگر میں شاہ ہمدان نے موجودہ خانقاہ معلّیٰ کے پاس قیام فرمایا اور وہاں ایک صفہ قائم کیا۔ جہاں آپ اور آپ کے ساتھیوں نے پہلی بار نماز با جماعت اور نماز جمعہ قائم کی۔ سلطان قطب الدین بھی یہیں پر حاضر خدمت ہوتے تھے۔ ۶۹؎

شاہ ہمدان کے ورود کشمیر کے وقت مسلمان اقلیت میں تھے۔ لباس، رہن سہن عادات واطوار میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان فرق کرنا مشکل

تھا۔ کہا جاتا ہے کہ علاؤالدین پورہ موجودہ خانقاہ معلّٰی میں ایک مندر تھا جہاں پر ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمان بادشاہ اور رعایا بھی پوجا کے لئے جاتے تھے۔ قحط سالی سے بچنے کے لئے بادشاہ نے یگیہ کیا اور برہمنوں کو تحائف دئے۔ سلطان قطب الدین نے شریعت اسلامی کے بالکل برعکس بیک وقت دو سگی بہنوں کو عقد نکاح میں رکھا تھا۔ شاہ ہمدان نے اس غیر اسلامی طرز عمل پر کڑی نکتہ چینی کی جس کے نتیجے میں سلطان نے ایک بیوی کو طلاق دے دی۔ شاہ ہمدان ہی کی ہدایات پر ہندوانہ لباس ترک کر کے مسلمان حکمرانوں کا لباس پہن لیا۔[۷۰]

شاہ ہمدان نے اشاعت و تبلیغ اسلام کے لئے اپنے رفقائے کار کو کشمیر کے مختلف گوشوں خاص طور پر ہندو مذہب کے مراکز مثلاً پانپور، اونتی پورہ، بیج بہاڑہ وغیرہ بھیجا۔[۷۱] جہاں پر انہوں نے مراکز تعمیر کئے اور اشاعت اسلام میں مشنری جذبہ کے ساتھ لگ گئے۔ شاہ ہمدان اور آپ کے رفقاء کے علم و فضل، زہد و ورع، تہذیب و اخلاق، روحانیت کے اعلیٰ مدارج اور پر خلوص دعوت دین سے کشمیر کے لوگ جوق در جوق آغوشِ اسلام میں آ گئے اندازہ ہے کہ ہزارون نفوس اسلام کے آبِ حیات سے سرفراز ہو گئے۔

''شاہ ہمدان نے کشمیر کے تعلقات ان ممالک سے قائم کئے جو اسلام، اسلامی تہذیب اسلامی فکر اور اسلامی فن و ادب کا سرچشمہ تھے۔ انہوں نے تقریباً دو سو کتابیں خود تصنیف کیں۔ ان کے رفقاء بھی وسط ایشیاء سے بہت سی کتابیں

ساتھ لائے تھے۔ حکمران کشمیران کے قدموں پر گرنا اپنے لئے باعث سعادت سمجھتا تھا۔ مگر وہ بدستور ہاتھ سے ٹوپیاں بنا کر کسب حلال سے اپنی زندگی گزارتے تھے۔ یہی درس انہوں نے اپنے رفقا اور متعلقین کو بھی دیا تھا۔ وہ خود مسلکا شافعی تھے وہ اگر چاہتے تو یہاں بھی بغیر کسی ادنیٰ مشکل کے اس مسلک کو پھیلاتے مگر چونکہ اس کے پیش رو مبلغ شرف الدین عبدالرحمٰن بلبلؒ حنفی تھے اور فقہی مسائل میں اسی مسلک کے مطابق تبلیغ کی تھی، اس لئے شیخ ہمدانی نے بھی اسی مسلک کو برقرار رکھا اور اسی کے مطابق لوگوں کو عبادت وعقائد کی تعلیم دی ۲ے۔

شاہ ہمدان اور ان کے ساتھی کشمیریوں کے لئے کوئی بوجھ نہیں تھے۔ یہ حضرات اپنے ساتھ ایرانی صنعت و حرفت بھی لائے۔ انہی حضرات کی کاوشوں سے کشمیر میں کئی دست کاریوں کا رواج ہوا۔ ان دستکاریوں کی وجہ سے کشمیر کو بڑی شہرت ملی اور کشمیری مسلمانوں کی اقتصادی حالت بھی بہتر ہوئی۔ آج بھی کشمیران دست کاریوں کی وجہ سے چاردانگ عالم میں مشہور ہے۔

غرض شاہ ہمدان نے یہاں کی تہذیب وتمدن، مذہب و اخلاق اور صنعت وحرفت کو بدل ڈالا۔ کشمیر پر ان کے اس احسان عظیم کا اعتراف ہر دور کے علماء وفضلاء اور صوفیائے کرام نے کیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ''کوچہ امیر کا گدا'' تصور کرتے ہیں اور ان کی ذات والا صفات سے عشق کا اظہار والہانہ انداز میں کرتے ہیں اس سلسلہ میں شیخ یعقوب صرفی، مرزا اکمل الدین بدخشی اور خواجہ

حبیب اللہ نوشہری کا نام لینا کافی ہوگا ۳ے۔ اقبالؔ نے بھی جاوید نامہ میں شاہ ہمدان کی خدمات عالیہ کا اعتراف اس طرح کیا ہے۔

سید السادات سالار عجم
دست او معمار تقدیرِ امم
تا غزالی درس اللہ ہُو گرفت
ذکر و فکر از دودمانِ او گرفت
مرشد آں کشور مینو نظیر
میر و درویش و سلاطین را مشیر
خطہ را آں شاہ دریا آستیں
داد علم و صنعت و تہذیب و دین
آفرید آں مرد ایران صغیر
باہنر ہائے غریب و دل پزیر
یک نگاہ او کشاید صد گرہ
خیزو تیرش را بدل راہے بدہ ۴ے

شاہ ہمدان ۷۸۶ھ میں یہاں سے مراجعت فرماتے ہیں جس کی وجہ

بعض مورخین کے نزدیک یہ تھی کہ چونکہ سلطان قطب الدین نے شاہ ہمدان کی خواہش کے مطابق مکمل طور پر اسلامی شریعت نافذ نہیں کی بلکہ سیاسی مصلحتوں سے کام لیا تو آپ نے بددل ہوکر کشمیر کو خیر باد کہا۔۷۵ مگر یہ رائے قابل قبول نہیں ہے۔ تذکروں اور کتب تواریخ میں مذکور ہے کہ سلطان نے شاہ ہمدان کو روکنے کی کافی کوشش کی مگر آپ نے نہیں مانا البتہ آپ نے سلطان کی درخواست پر میر حاجی محمد کو شرعی معاملات میں راہنمائی کے لیے یہیں رکنے کا حکم دیا۔۷۶ ظاہر ہے کہ یہ بات جب ہی ممکن ہوسکتی تھی جب سلطان اور شاہ ہمدان کے تعلقات استوار رہے ہوں۔

شاہ ہمدان جب کنار پہنچ گئے تو یہاں کے سلطان خضر نے انھیں چند دن قیام فرمانے پر آمادہ کیا۔ یہیں پر آپ بیمار ہوئے اور چھ ذی الحجہ ۷۸۶ھ بمطابق ۱۹ جنوری ۱۳۸۵ء کو تہتر سال کی عمر میں راہ سپار عالم آخرت ہوئے۔۷۷ بعد میں آپ کی میت کو ختلاں لیجایا گیا جہاں آپ کو ۲۵ جمادی الاولیٰ ۷۸۷ھ مطابق ۱۴ جولائی ۱۳۸۵ء کو سپرد خاک کیا گیا۔۷۸

مراجع

۱) اقبال، ایس۔ایم: دی کلچر آف کشمیر (ترتیب) مقالہ ''ایڈوینٹ آف اسلام ان کشمیر۔ مروہ پبلکیشنز، نئی دہلی ۱۹۷۸ء، ص ۲۲۰

۲) زتشی، این۔کے: سلطان زین العابدین بڈشاہ آف کشمیر۔ لکھنو ۱۹۷۶ء۔ ص ص ۴۔۵

۳) عبدالحی، مولانا: نزہتہ الخواطر۔ حیدرآباد، دکن۔ جلد ۲، ص ۸۷

۴) بروکلمان، جلد ۲، ص ۲۱۱

۵) صوفی، جی۔ایم۔ڈی: کشیر۔ نئی دہلی ۱۹۷۴، جلد ۲، ص ۸۵

۶) مسکین، حاجی محی الدین: تحائف الابرار۔ امرتسر، ۱۳۲۱ھ، ص ۱۱

۷) رحمان علی: تذکرہ علمائے ہند۔ نولکشور پریس ۱۹۱۷ء، ص ۱۴۷

۸) الزرکلی، خیرالدین: قاموس الاعلام، جلد ۵

۹) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ لیڈن ۱۹۶۰ء، جلد ۱، ص ۳۹۲

۱۰) سہ ماہی اقبال، لاہور، جون ۱۹۷۲ء۔ مقالہ ''شاہ ہمدانؒ'' ص ۷۰

۱۱) کشمیر انڈر سلطانز۔ سرینگر، ۱۹۷۴ء، ص ۵۵

۱۲) صوفی ازم ان کشمیر، ص ۳۱

۱۳) اے ہسٹری آف مسلم رول ان کشمیر۔ دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۱۰۲

۱۴) اے ہسٹری آف کشمیر۔ دہلی، ص ۵۲۵

۱۵) بدخشی، نورالدین جعفر: خلاصۃ المناقب (قلمی) بحوالہ سید میر علی الہمدانی از ڈاکٹر سیدہ اشرف علی، دہلی رپرنٹ، ص ۱۵

۱۶) ایضاً، ص ۱۵

۱۷) خلاصۃ المناقب بحوالہ سید میر علی الہمدانی، ص ۱۷

۱۸) خلاصۃ المناقب بحوالہ صوفی ازم ان کشمیر، ص ۳۱

۱۹) خلاصۃ المناقب بحوالہ سید میر علی الہمدانی، ص ۲۰

۲۰) ایضاً۔ جامی، عبدالرحمان۔ نفحات الانس۔ کتب فروش سعدی، ۱۳۳۷ قمری، ص

۲۱) نوری، عبدالوہاب۔ فتحات الکبرویہ، قلمی نسخہ ریسرچ لائبری، یونیورسٹی آف کشمیر، سرینگر، نمبر ۸۶۶، ص ۲۲۶

۲۲) خلاصۃ المناقب بحوالہ کشمیر میں اسلام کی اشاعت از ڈاکٹر محمد فاروق بخاری ص ۶۲

۲۳) ایضاً، ص ۴۰

۲۴) لطائف اشرفی بحوالہ بزم صوفیہ از سید صباح الدین عبدالرحمان

۲۵) بحرالعرفان (قلمی) بحوالہ کشمیر میں اسلام کی اشاعت، ص ۷۳

۲۶) واقعات کشمیر، قلمی نسخہ ریسرچ لائبری سرینگر

۲۷) تاریخ کشمیر، ادارہ تحقیقات ونشریات سرینگر، ص ۱۳

۲۸) روضات الجنات بحوالہ سید میر علی الہمدانی، ص ۶۷

۲۹) اسرارالابرار، ص ۱۶

۳۰) تکملہ، جلد ۳، ص ۳۸

۳۱) اورینٹل بیوگرافیکل ڈکشنری، ص ۳۳۸
۳۲) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، جلد ۱
۳۳) نزہتہ الخواطر، جلد ۲، ص ۸۷
۳۴) یغما بحوالہ سید میر علی الہمدانی، ص ۶۳
۳۵) کشمیر انڈر سلطانز، ص ۵۶
۳۶) سہ ماہی اقبال، ص ص ۴۷۔۷۶
۳۷) اے ہسٹری آف مسلم رول ان کشمیر، ص ۱۰۳
۳۸) اے ہسٹری آف کشمیر، ص ۵۲۵
۳۹) سید میر علی الہمدانی، ص ص ۶۲۔۷۱
۴۰) یزدی۔ ظفر نامہ، جلد ۱، ص ۲۸۷
۴۱) صوفی ازم ان کشمیر، ص ۳۴
۴۲) ایضاً
۴۳) ملفوظات تیموری (انگریزی ترجمہ اسٹوارٹ) ص ۱۴
۴۴) ظفر نامہ، جلد ۱، ص ۶
۴۵) منقبتہ الجواہر مع اردو ترجمہ، سرینگر ۱۴۰۵ھ، ص ص ۱۷۴۔۱۷۵
۴۶) تاریخ رشیدی (انگریزی ترجمہ پٹنہ ۱۹۷۳ء) ص ص ۴۳۲۔۴۳۳
۴۷) آئین اکبری، لکھنو ۱۸۶۹ء، جلد ۲، ص ۱۸۵
۴۷)(۱) تاریخ کشمیر (قلمی نسخہ ریسرچ لائبریری سرینگر نمبر ۷۳۹) برگ ۲
۴۸) بہارستان شاہی (مقدمہ و تحقیق و ترتیب ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری) انجمن شرعی

شیعان، بڈگام کشمیر، ۱۹۸۲ء، ص ۲۶۶

۴۹) تاریخ کشمیر (قلمی نسخہ ریسرچ لائبریری سرینگر نمبر ۳۹) ص ۴۲

۵۰) واقعات کشمیر، قلمی، ص ۳۸

۵۱) تاریخ حسن، جلد ۳، ص ص ۱۴۔۱۵

۵۲) اسرارالابرار، ص ص ۱۲۔۱۴

۵۳) کشیر، جلد ۱، ص ۸۶

۵۴) سہ ماہی اقبال، ص ص ۷۸۔۷۹

۵۵) کشمیر انڈر سلطانز، ص ص ۵۵۔۵۶

۵۶) کشمیر میں اسلام کی اشاعت، ص ص ۱۱۲، ۱۱۵، ۱۲۲

۵۷) میر سید علی الہمدانی، ص ص ۷۲۔۷۸

۵۸) اے ہسٹری آف کشمیر، ص ۵۲۵

۵۹) تاریخ کشمیر (قلمی) برگ ۳

۶۰) ایضاً برگ ۴

۶۱) بہارستان شاہی، ص ۲۶۶

۶۲) تاریخ حسن، جلد ۲، ص ص ۱۷۳۔۱۷۵

۶۳) اسرارالابرار، ص ۱۲

۶۴) اے ہسٹری آف مسلم رول ان کشمیر، ص ص ۱۰۳۔۱۰۴

۶۵) صوفی ازم ان کشمیر، ص ۳۶

۶۶) منقبۃ الجواہر، ص ۲۱۲

۶۷) تاریخ حسن، جلد۲، ص ۱۷۳

۶۸) تاریخ کشمیر، برگ ۳

۶۸) ا منقبتہ الجواہر ص ص ۳۰۳۔۳۰۴

۶۹) بہارستان شاہی، ص ۲۶۶۔فتحات الکبرویہ (قلمی) ص ۲۴۴

۷۰) فتحات الکبرویہ (قلمی) ص ۲۴۴

۷۱) سید علی: تاریخ کشمیر، برگ ۷۔۹

۷۲) کشمیر میں اسلام کی اشاعت، ص ۱۲۳

۷۳) دیکھئے دیوان صرفی۔مرتبہ حبیب اللہ کاملی،.بحرالعرفان از شیخ اکمل الدین بدخشی بروکاز پرس ۱۳۸۱ھ، جلد ۱۔خواجہ حبیب اللہ نوشہری کی منقبت کے لیے دیکھئے رسالہ ہمدانیہ مع اردو ترجمہ، سرینگر ۱۹۷۷ء

۷۴) جاوید نامہ، ص ۱۸۵

۷۵) بہارستان شاہی، ص ۲۶۶

۷۶) فتحات الکبرویہ (قلمی) برگ ۱۵۱ ب بحوالہ کشمیر انڈر سلطانز ص ۵۷

۷۷) خلاصتہ المناقب بحوالہ صوفی ازم ان کشمیر ص ۳۹، فتحات االکبرویہ (قلمی) ص ۲۵۴

۷۸) ایضاً

حضرت شاہ ہمدانؒ کے سیاسی افکار

حضرت سید علی ہمدانی المعروف بہ شاہ ہمدانؒ (۱۳۱۴ء--۱۳۸۵ء) کی اصل شہرت صوفی اور مبلغ کی حیثیت سے ہے۔انہوں نے اسلام کی ترویج واشاعت کے لئے اپنی عمرِ عزیز کے اکیس برس صرف کئے اور اس مقصد سے مزدقان ،ختلان ،بلخ، بدخشان ،ختا ،یزد ،شام ،بغداد ،روم،ماوراالنہر ،بیت المقدس ،سیلون ،ایلاق، جبل الفتح ،جزیرہ صحف ، جبل لبنان ،جبل القدوم،گاذون،جبل الابواب اور کشمیر وغیرہ کی سیاحت کی۔[۱] نتائج کے اعتبار سے کشمیر کی سیاحت اہم مانی جاتی ہے کیونکہ یہاں شاہ ہمدانؒ اُن کے رفقائے کار اور اُن کے فرزند نامدار ہی کی مبارک کوششوں سے اسلام تحریکی انداز میں پھیلا،جس کے نتیجے میں ہزاروں بندگانِ خدا اسلام کے نور سے منوّر ہوئے اور کشمیر میں سیاسی ،سماجی اور مذہبی انقلاب آ گیا اور وہ ہمیشہ کیلئے مسلمانوں کا مرکز بن گیا۔

مگر شاہ ہمدانؒ نہ صرف ایک صوفی صافی ،مبلغِ اسلام اور مشہور جہاں گرد تھے بلکہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے مصنف و شاعر بھی تھے۔تذکروں میں ان کی

تصانیف کی تعداد ایک سوستر بتائی گئی ہے جن کو موضوعات کے لحاظ سے قرآنی مطالب، احادیث، رسالت، اوراد و ادعیہ، تصوف و عرفان، فقر و فتوت، اسرار و رموز، اخلاقیات، اصطلاحات، صحت و طب، توبہ و انابت، و اردات و خاطرات، حکمت عملی و نظری، عقل و فراست جیسے عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔[۳]

سیاست سے حضرت شاہ ہمدانؒ کا اصلاً کوئی سروکار نہ تھا تاہم اپنے وقت کے کئی حکمرانوں سے ان کے مراسم تھے۔ جن کے نام وہ اصلاحی مکاتیب بھی لکھتے رہے۔ انہی حکمرانوں میں سے ایک کی استدعا پر انہوں نے فارسی میں ایک کتاب ''ذخیرۃ الملوک'' تصنیف کی تھی جو اُن کی ضخیم اور اہم کتاب ہے۔ اس کے ترجمے اردو، لاطینی، فرانسیسی اور ترکی زبانوں میں ہوئے ہیں۔

''ذخیرۃ الملوک'' دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کے پانچویں باب میں شاہ ہمدانؒ نے حکومت و سلطنت کے بارے میں اپنے خیالات تفصیل سے ظاہر کئے ہیں۔

حکومت و حاکم کی ضرورت:

حضرت شاہ ہمدانؒ کے نزدیک ایک صحت مند اور بہتر معاشرہ کیلئے حکومت کا ہونا ضروری ہے۔ اکابر علماء اور اہل بصیرت حکماء و فلاسفہ کے نزدیک

یہ بات مسلّم ہے کہ انسانی نفوس و طبائع اپنی اپنی جُدا جُدا خصوصیات اور مختلف صلاحیتوں کے لحاظ سے انوارِ جمالی و جلالی کا فیضان حاصل کرنے میں متفاوت واقع ہوئی ہیں اور اسی بناء پر لوگوں کے مطالب و مقاصد اور اغراض ایک دوسرے سے مختلف ہو گئے ہیں اور ان کے عقائد اور اخلاق و افعال میں کھلا فرق واقع ہو گیا ہے اور مذموم اوصاف اور رذایل اخلاق مثلاً ظلم و ستم، زیادتی، کینہ، حسد اور بُخل آدمی کی فطرت میں داخل ہو گئے ہیں۔ لہٰذا خداوند برتر کی کامل حکمت نے چاہا کہ لوگوں کے درمیاں ایک حاکمِ عادل اور مصلح کامل موجود ہو جو اولادِ آدم کے احکام کی کارگذاریوں اور اہل عالم کی سرگرمیوں کے معاملات کو فیصلہ کُن قوت، موثر نصیحت و فہمایش اور مناسب تعلیم و تربیت سے صحیح راستے پر لگا دے اور احکام شریعت کو نافذ کرنے میں ممکن حد تک پوری کوشش کرے۔ اسلامی حدود و قوانین کی حفاظت کے لئے لوگوں کے درمیان مساوات اور برابری قائم رکھے اور سیاسی طاقت اور انسدادی تدابیر کو بروئے کار لا کر طاقتور کے ظلم و زیادتی کرنے والے ہاتھوں کو کمزوروں اور مظلوموں کی طرف بڑھنے سے روکے تا کہ زندگی کا نظام صحیح صورت میں قائم رہے۔[۳]

خلیفہ و حکومت کی ضرورت واضح کرنے کے بعد حضرت شاہ ہمدانؒ لکھتے ہیں کہ اسلامی حکومت اصل میں خلافت ربانی ہے۔ اس لئے جو کوئی عدل و احسان کے ساتھ حدود شرع کی حفاظت اور احکام دین کو دنیا میں نافذ کرنے کی

کوشش کرے وہ زمین میں اللہ کا نائب، برگزیدہ سایہ الٰہی اور خلیفۂ رحمان ہوگا۔اس کے برعکس جو حکمران عدل وانصاف کو پس پشت ڈال کر خواہشات نفس کی غلامی میں شریعت اسلامیہ کو نافذ کرنے میں عدم دلچسپی سے کام لے گا وہ حقیقت میں دجال کا نائب، خدا اور رسول ﷺ کا دشمن اور خلیفۂ شیطان ہوگا۔۵

حضرت شاہ ہمدانؒ کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے بعد خلفائے راشدینؓ کی پیروی ایک مسلمان حکمران کیلئے لازمی ہے۔انہوں نے حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ کے واقعات پیش کر کے مسلمان حکمران کے سامنے ایک ایسا نمونہ رکھا ہے جس پر چل کر وہ اپنی سلطنت میں دیانت وامانت، عدل وانصاف، رحم والفت، کشادہ دلی، عفو و درگذر اور آزادی تنقید و تقریر کی مثالیں پیش کرسکتا ہے۔

مثالی حکومت کی اہم شرطیں:

ایک مثالی حکومت کے لئے شاہ ہمدانؒ نے دس شرطوں کو ضروری قرار دیا ہے جن کے بغیر سلطنت کے دینی اور دنیاوی امور ومسائل کا صحیح انتظام نہیں ہوسکتا ہے۔

پہلی شرط یہ ہے کہ حکمران اپنے آپ کو رعایا ہی کے مانند ایک فرد تصور

کرے اور دوسروں کو اپنے اُوپر حاکم سمجھے اس لئے جب کوئی واقعہ یا مسئلہ درپیش ہو تو اس میں دوسرے کا جو فیصلہ اپنے لئے جائز نہ سمجھے، اپنا بھی ویسا ہی فیصلہ دوسرے کے لئے جائز نہ سمجھے اور جو کچھ اپنے لئے پسند نہیں کرتا اسے کسی مسلمان کے لئے پسند نہ کرے۔[۶]

دوسری شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کی حاجت پوری کرنے کو اعلیٰ عبادت سمجھے۔ محتاجوں اور ضرورتمندوں کے لئے فکر مند رہے اور ان کی ضرورتوں اور فرمائشوں کا منتظر رہے اور جب اسے معلوم ہو کہ کوئی مسلمان کسی کام کے لئے اس کے دروازے پر منتظر ہے تو جب تک اس کی حاجت پوری نہ کر لے کسی عبادت میں مشغول نہ ہو اور اپنے آرام کی خاطر مسلمانوں کی حاجتوں سے بے پروائی نہ برتے۔[۶]

تیسری شرط یہ ہے کہ کھانے پینے اور لباس میں خلفائے راشدینؓ کی سیرت کی پیروی کرے اور اپنے نفس کو اچھی غذا اور پُر تکلف لباس کا عادی نہ بنائے۔[۷]

چوتھی شرط یہ ہے کہ شرعی حکم میں نرمی سے بات کہے اور بے وجہ سختی نہ کرے اور لوگوں کے عذر سننے سے ملول نہ ہو اور کمزوروں اور محتاجوں سے بات کرنے میں اسے عار معلوم نہ ہو۔[۸]

پانچویں شرط یہ ہے کہ مخلوق کو راضی رکھنے کے لئے احکام الٰہی کو جاری و

نافذ کرنے میں سستی اور نرمی نہ کرے اور کسی کی خوشنودی کے لئے شریعت کے احکام کی خلاف ورزی یا اس سے گُریز روانہ رکھے اور یہ جان لے کہ حکومت کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ لوگوں میں سے نصف حاکم سے ناراض ہی رہا کرتے ہیں کیونکہ ہر فریق کو حق و انصاف کے ذریعے خوش نہیں رکھا جا سکتا اور تمام لوگوں کو راضی رکھنا عادل حکمران کے لئے کسی طرح ممکن نہیں۔ حاکم کا حکم بے طمع اور بے غرض اور صرف اللہ کی رضا کے لئے ہونا چاہئیے۔ اسے لوگوں کی ناراضگی سے نہیں ڈرنا چاہیئے۔[۱۰]

چھٹی شرط یہ ہے کہ وہ حکومت و ولایت کی عظمت و اہمیت سے غافل نہ رہے اور یقین جانے کہ حکومت و امارت ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے ذریعے آخرت کی سعادت اور نیک نامی بھی حاصل کی جا سکتی ہے اور اسی سے انسان ابدی شقاوت، عداوت اور بدنامی میں بھی مبتلا ہو سکتا ہے۔ لیکن اکثر بادشاہوں کا یہی حال ہے کہ وہ دنیا کی مکدّر اور فانی دولت پر اِترانے لگتے ہیں اور خواہشاتِ نفس کے پیچھے چل کر اپنے دین کو تباہ اور جھوٹی عزّت کے لئے ایمان کو برباد کر دیتے ہیں۔[۱۰]

ساتویں شرط یہ ہے کہ صلحاً و علمائے دین کی زیارت و صحبت کا راغب اور خواستگار ہو اور دجال سیرت جاہلوں اور نیک صورت فاسقوں سے احتراز کرے، جو علماً و مشائخ کے بھیس میں رہتے ہیں۔ مگر دنیاوی طمع کے واسطے ہر

کمینے ظالم کی تعریفیں کرتے ہیں۔[۱۱]

آٹھویں شرط یہ ہے کہ حاکم تکبّر اور جبر وسختی سے مخلوق کو اپنے سے منـ
اور بیزار نہ کرے۔ بلکہ کمزوروں اور زیردستوں کے ساتھ عدل و احسان
شفقت کر کے اپنے آپ کو رعایا کا محبوب اور پیارا بنالے۔[۱۲]

صاحب سلطنت کی نویں شرط یہ ہے کہ اپنے نائبوں اور عاملوں
حاکموں کی خیانت اور ظلم سے غافل نہ ہو اور بھیڑیوں کی خصلت والے ظالم
مظلوم رعایا پر مسلط نہ کرے اور جب ان میں سے کسی ایک کی خیانت ظا
اس کو گرفت میں لا کر ایسی سزا دے جو دوسروں کے لئے عبرت ہو اور حکومـ
سیاست اور رعب داب میں سہل انگاری اور سستی روا نہ رکھے اور دولت منـ
کو نصیحت اور خوف دونوں کے ذریعہ مہذب بنائے اور راہِ راست پر لائے۔[۱۳]

دسویں شرط فراست اور عقل مندی ہے۔ ہر حاکم اور بادشاہ پر وا
ہے کہ حوادث وواقعات اور مسائل میں گہرے غور وفکر اور عقل وفہم سے کام
ہر حکم کی حقیقت کی خوب چھان بین کرے اور بصیرت کی آنکھ سے لوازم،
اور عوارض پر نظر کرے۔ اگر یہ نمایاں امور میں سے ہو تو شریعت کی روشنی میـ
ان کا فیصلہ کر دے اور اگر مخفی، پوشیدہ، پیچیدہ اور مشکل معاملہ ہو تو اس کی گـ
فراست سے تاڑے اور ایسے معاملے میں محض نقل کرنے والوں پر اعتماد نہ
کیونکہ حوادث ومسایل بے انتہا اور لامحدود ہوتے ہیں اور مذکورہ مسائل

ہیں۔اس لئے محدود لامحدود کو حل کرنے میں کافی نہیں ہوسکتا۔۱۵

مسلم رعایا کے حقوق:

حضرت شاہ ہمدانؒ نے اسلامی ریاست میں مسلموں، غیر مسلموں اور ذمیوں کے حقوق پر بھی تفصیلی بحث کی ہے۔ان کے نزدیک مسلم رعایا کے بیس حقوق حکمرانوں پر عائد ہوتے ہیں۔ان کو ادا کرنا حکمران پر فرض ہے۔ان حقوق کی تفصیل بیان کرتے وقت حضرت شاہ ہمدانؒ نے قرآن وحدیث، اسوہ رسول ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کے عمل سے استناد کیا ہے۔

حاکم پر مسلم رعایا کا پہلا حق یہ ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کے ساتھ تواضع سے پیش آئے اور حکومت وولایت کی وجہ سے کسی مسلمان کے ساتھ تکبر سے پیش نہ آئے اور یقین رکھے کہ اللہ متکبروں اور جباروں کو دشمن رکھتا ہے۔

دوسرا حق یہ ہے کہ حاکم ایک دوسرے کی نسبت عوام الناس کی باتیں نہ سنے کیونکہ اس کا نتیجہ فتنہ وندامت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔خصوصاً فاسقوں، خودغرضوں، حاسدوں اور حریصوں کی باتوں پر اعتماد نہ کرے۔کیونکہ لالچی آدمی اپنے ایک لُقمے کے واسطے کئی لوگوں کو رنج پہنچاتا ہے اور حاسد ہر ہنر کو عیب سمجھتا ہے۔۱۵

تیسرا حق یہ ہے کہ حاکم جب کسی لغزش یا قصور کی وجہ سے کسی مسلمان پر

غصہ کرے اور معاف کر دینے کی گنجائش موجود ہو تو معاف کرنے میں تین دن سے زیادہ تاخیر نہ کرے یہ اس صورت میں ہے جب اُس نے کسی ایسی بات کی وجہ سے غصہ کیا ہو جس میں دین کا نقصان نہ ہوتا ہو اگر دین کا نقصان ہو تو اس سے تمام عمر بھی کنارہ کش رہنا جائز ہے۔[16]

چوتھا حق یہ ہے کہ عدل و احسان کا فیض تمام رعایا کے لئے عام کر دے اور احسان کرنے میں اہل اور نا اہل کے درمیان فرق نہ کرے کیونکہ حاکم خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ جس طرح اللہ کی رحمت مومن و کافر سب پر پھیلی ہوئی ہے اسی طرح حاکم کا عدل و احسان بھی نیک و بد سب کو شامل ہونا چاہیئے۔[17]

پانچواں حق یہ ہے کہ حکومت و بادشاہی کے رعب داب کی بنا پر مسلمانوں کے گھروں میں تاک جھانک نہ کرے اور اجازت لئے بغیر رعایا کے گھروں میں داخل نہ ہو۔

چھٹا حق یہ ہے کہ مختلف قسم کے لوگوں سے ایک ہی جیسی گفتگو کے انداز کا متوقع نہ رہے بلکہ وہ جس حیثیت اور مرتبے کے ہیں اسی حیثیت اور درجہ کی اس سے بات کریں گے ۔ظالموں اور اوباشوں سے نرم گفتگو کی امید نہ رکھے۔ جاہل لوگوں سے فصیح و بلیغ بات چیت کی توقع نہ کرے۔ وحشی اور اُجڑ لوگوں سے اس کا آرزومند نہ ہو کہ وہ اس ادب و وقار کو ملحوظ رکھیں گے جو شرفاء رکھتے ہیں۔ اسی طرح ہر آدمی پر اس کی حالت و حیثیت کے مطابق ذمہ داری ڈالے اور اُن کی

حیثیت ومرتبے کی وجہ سے ان کو معذور سمجھے۔ کسی سے میل جول میں نفرت نہ کرے۔

ساتواں حق یہ ہے کہ مجلس میں بوڑھوں کا احترام کرے۔ خصوصاً ان بوڑھوں کا جو دیندار ہوں اور بچوں کو شفقت کی نظر سے دیکھے۔

آٹھواں حق یہ ہے کہ ہر مسلمان سے جس کام کا وعدہ کرے، اس کو پورا کرے اور اسکی خلاف ورزی ہرگز نہ کرے۔[۱۸]

نواں حق یہ ہے کہ حکم دینے اور فیصلہ کرنے میں سختی اور ترش روئی نہ کرے اور وضیع وشریف اور امیر وغریب سب کے ساتھ کشادہ روئی سے پیش آئے اور ضعیفوں کے ساتھ نرمی اور مدارات سے بات کرے۔

دسواں حق یہ ہے کہ انصاف کو مدنظر رکھے اور جس طرح کے انصاف کا وہ خود لوگوں سے متوقع رہتا ہے۔ اسی طرح کا انصاف ان سے بھی کرے اور مسلمانوں سے ایسا معاملہ کرے جو اگر لوگ اس سے کریں تو وہ اسے پسند کرے۔[۱۹]

گیارہواں حق یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان مصالحت میں جلدی کرنا اپنے اوپر فرض سمجھے اور ان کے جھگڑوں کا تصفیہ کرنے میں تاخیر نہ کرے۔ خصوصاً ان اختلافات میں جن کی حقیقت ظاہر وباہر ہو کیونکہ یہ مخاصمت اور دشمنی کا ذریعہ بننے کے علاوہ موجب فساد بھی ہوسکتا ہے۔[۲۰]

بارہواں حق یہ ہے کہ حاکم نہ مسلمانوں کے گناہوں کی ٹوہ میں رہے اور نہ ہر لغزش پر ضعیف رعیت کو ستائے بلکہ جہاں تک ممکن ہو لوگوں کی غلطیوں سے درگذر کرے اور ان کے عیوب کو پوشیدہ رکھے۔

تیرہواں حق یہ ہے کہ حاکم شکوک وشبہات سے پرہیز کرے اور تہمت کے مواقع سے احتراز کرے ورنہ لوگ گناہوں پر دلیر ہو جائیں گے، اگر خدانخواستہ وہ کبھی کسی گناہ میں ملوث ہو جائے تو اس کو لوگوں سے مخفی اور پوشیدہ رکھے۔ کیونکہ عام لوگ نیکی اور بدی میں حاکم کے تابع اور پیرو ہوتے ہیں۔[۲۱]

چودہواں حق یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کی کوئی حاجت براری حاکم کی سفارش پر موقوف ہو تو وہ سفارش کر کے اس کی مشکل دور کرنے میں غفلت و کوتاہی سے کام نہ لے۔

پندرہواں حق یہ ہے کہ حاکم طاقتوروں اور دولت مندوں کے مقابلہ میں مجبور، کمزور اور غریب لوگوں کو ترجیح دے اور عموماً فقراء اور اہل اللہ کی ہم نشینی و صحبت اختیار کرے اور ہر روز اپنے دل کے آئینے کو لوگوں کے وعظ و نصیحت سے جلا دیتا رہے۔[۲۲]

سولہواں حق یہ ہے کہ فقر و فاقہ کے حالات سے غافل نہ رہے اور بیوگان اور یتیموں کے حالات کی خبر گیری اپنے اوپر فرض سمجھے اور قیامت کی باز پرس سے ڈرے کہ جس دن مال اور مُلک کام نہیں آئیگا۔ اسلئے آج جبکہ وہ طاقت رکھتا ہے

تو اپنی ذمہ داری ادا کرنے کی کوشش کرے۔۲۳

سترہواں حق یہ ہے کہ حاکم اپنے سیاسی دبدبے سے کام لے کر مسلمانوں کے راستے کو پُر امن رکھے اور ڈاکوؤں اور چوروں بلکہ رہزنی کرنے والوں اور مسلمانوں کو لوٹنے والوں کو تلاش کر کے انہیں سخت عبرت ناک سزا دے۔ حاکم خوف وخطرے کی جگہوں پر عمارتیں بنوادے ورنہ کم از کم محافظ اور نگہبان مقرر کردے۔۲۴

اٹھارواں حق یہ ہے کہ جہاں سرائے یا پُل کی تعمیر ضروری ہو اُن کے بنوانے میں غفلت سے کام نہ لے۔

انیسواں حق یہ ہے کہ حاکم مسلمانوں کی ہر بستی میں مسجد بنائے اس کے لئے امام اور مؤذن مقرر کرے، جن کے گذارے کے لئے وظائف مقرر کرے تاکہ وہ فارغ البال ہو کر اوقاتِ نماز کی پابندی کر سکیں اور ضروریاتِ زندگی اس میں مانع نہ ہو سکیں۔۲۵

بیسواں حق یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے غافل نہ ہو بلکہ خاص وعام سب کی تبلیغ ودعوت کے لئے نظم ونسق کرے۔۲۶

مسلم رعایا کے علاوہ حضرت شاہ ہمدانؒ نے غیر مسلموں اور ذمیوں کے حقوق بھی بیان کئے ہیں اور حضرت عمرؓ کی جانب منسوب ایک معاہدہ امن کا ذکر کر کے اس کی بیس شرائط بھی تحریر کی ہیں، لیکن اسکے تعلق سے متعدد اہل علم نے

حضرت شاہ ہمدانؒ پر اعتراضات کئے ہیں۔

ظاہر ہے حضرت شاہ ہمدانؒ کے خیالات صحیفۂ آسمانی نہیں ہیں کہ ان کو اعتراض سے بالاتر سمجھا جائے۔ تاہم یہ بات ضرور پیش نظر رہنی چاہیئے کہ ہر عہد کے کچھ سیاسی، سماجی اور مذہبی تقاضے ہوتے ہیں جن کے اثرات اس عہد کے علماء ومشائخ کے خیالات پر بھی مترتب ہوتے ہیں۔

حوالے

خلاصۃ المناقب بحوالہ سیّد میر علی ہمدانیؒ از ڈاکٹر سیدہ اشرف ظفر، تاج کمپنی دہلی، ص ص ۴۳_۴۴

میر سیّد علی ہمدانی، ص ص ۱۹۱_۱۹۳

صحیفۃ السلوک، اردو ترجمہ ذخیرہ الملوک از صدرالدین الرفاعی المجددی (شاہ ہمدان پبلک ویلفیر ٹرسٹ، سرینگر، ۱۹۸۹ء) ص ص ۳۳۶_۳۳۷

صحیفۃ السلوک، اردو ترجمہ ذخیرہ الملوک، ص ص ۳۴۸_۳۴۹

ایضاً، ص ۳۵۰

ایضاً، ص ۳۵۱

ایضاً، ص ۳۵۱

ایضاً، ص ۳۵۱

ایضاً، ص ۳۵۲

ایضاً، ص ص ۳۵۲_۳۵۳

ایضاً، ص ۳۵۳

ایضاً، ص ۳۵۴

ایضاً، ص ص ۳۵۴_۳۵۵

ایضاً، ص ص ۳۵۵_۳۵۶

۱۵) ایضاً، ص ص ۳۶۰_۳۶۱

۱۶) ایضاً، ص ۳۶۲

۱۷) ایضاً، ص ۳۶۲

۱۸) ایضاً، ص ص ۳۶۳_۳۶۵

۱۹) ایضاً، ص ص ۳۶۳_۳۶۵

۲۰) ایضاً، ص ۳۶۵

۲۱) ایضاً، ص ۳۶۶

۲۲) ایضاً، ص ۳۶۸

۲۳) ایضاً، ص ۳۶۹

۲۴) ایضاً، ص ۳۶۹

۲۵) ایضاً، ص ۳۷۰

۲۶) ایضاً، ص ۳۷۰

ابتدائی عرب تاریخ نگاری کا ایک مختصر جائزہ

عرب تاریخ نگاری بحیثیت ایک فن کے ایک طویل اور مسلسل عمل کا نتیجہ ہے۔اس فن نے آہستہ آہستہ ایک ایسی غیر معمولی سائنس کی شکل اختیار کر لی جسے کسی بھی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اس فن کی جڑیں عرب سوسائٹی میں اتنی گہری ہیں کہ محض تحریری ریکارڈ اس کی تمام تفصیلات فراہم کرنے سے قاصر ہے۔[1]

قدیم ترین عرب سماج جس کے بارے میں ہمیں معلوم ہو سکا ہے خانہ بدوشانہ تھا۔اس کے علاوہ کچھ مستقل بستیاں بھی تھیں جن کے بارے میں ہم محدود معلومات رکھتے ہیں۔جنوبی عرب میں کھدائی کے دوران کچھ کتبات ملے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ بارہ سوق۔م میں وہاں چار ریاستیں تھیں۔ریاست کا سربراہ دنیاوی اور دینی مرتبہ پر فائز ہوتا تھا۔گو یہ کتبات مذہبی نوعیت کے ہیں مگر پھر بھی کسی قدر انسانی سرگرمی کا پتہ دیتے ہیں۔ان میں تاریخی شعور کا احساس ملتا ہے۔یمنی روایات ہمیں زبان،صنعت وحرفت،ادب اور یمنیوں کے شمالی عربوں پر احساس برتری کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں۔شمالی عرب

میں ہمیں حیرہ کے عربوں ،ان کے انساب اور بادشاہوں کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔شمالی عربوں نے اپنے معبودوں سے متعلق واقعات،سماجی حالات اور انساب کو زبانی روایات کے ذریعہ محفوظ کیا۔ان تمام چیزوں کو بعد میں جمع کر کے ''ایام العرب'' کا نام دیا گیا۔[۲] ہم اس سلسلہ میں صرف مورخین ہی کے مرہون منت نہیں ہیں جنھوں نے قدیم روایات کو محفوظ کر لیا بلکہ شعراء جاہلیت کا بھی اس میں بہت کچھ دخل ہے جنھوں نے اپنے قبائل کے فخریہ کارناموں اور اپنے آباؤ اجداد کی مایہ ناز سرگرمیوں کو احساس برتری کے تحت اپنی شاعری میں محفوظ کر لیا۔ [۳]

قرآن مجید نے اپنے نزول کے وقت ہی سے عربوں کی تاریخ اور اس مشن پر تفصیلی روشنی ڈالی جس کی طرف انھیں دعوت دی جا رہی تھی۔قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی پہلی نسل تلاش و تحقیق کے فطری تقاضوں اور اپنی دینی ضرورت کے تحت اس طرف مائل ہوئی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ،ان کی سرگرمیوں اور کارناموں کو خود اپنے اور ساری انسانیت کے لئے جمع کریں۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پیغمبر ﷺ کے اقوال و افعال کو جمع کیا گیا اور اس سارے ذخیرے کو مجموعہ احادیث کی شکل دے دی گئی،رسول اللہ ﷺ کے ہر فعل و قول کو راویوں کی ایک کڑی سے جوڑ دیا گیا جسے ''اسناد'' کہتے ہیں۔اسی ذخیرہ احادیث سے ایک بڑا سرمایہ بھی فراہم ہوا،جس کے سلسلے میں مسلمان علماء و فضلاء کی طرف

سے تہذیب و ترتیب کا کام جاری رہا۔اسی مواد سے اسلامی قانون، رسوم اور تاریخ نگاری وجود میں آئے۔رسول اللہ کی سیرت طیبہ اور صحابہ کرامؓ کے حالات زندگی نے ابتدائی عرب تاریخ نگاری کے لئے بنیاد فراہم کی۔رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال کو اسناد کے ساتھ ضبط تحریر میں لانا عرب تاریخ نگاری پر اس قدر اثر انداز ہوا کہ صدیوں تک یہ طریقہ عرب تاریخ نگاری کا جز بن گیا۔[۴] جن حضرات نے سیرت ومغازی کو اس انداز پر ترتیب دیا ان میں چند معتبر حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں :ابان بن عثمانؓ (م۱۰۵ھ)،عروہ بن زبیرؓ (م۹۲ھ)،شرجیل بن سعد (م۱۲۳ھ)،وہب بن منبہ (م۱۱۰ھ)،ابن شہاب الزہری (م۱۴۱ھ)، عاصم بن عمرو بن قتادہ (م۱۲۰ھ)، عبد اللہ بن ابو بکرؓ (م۱۲۵)، موسی بن عقبہ (م۱۴۱ھ)،معمر بن راشد۔(م۱۵۰ھ)، ابن اسحاق (م۱۵۲ھ)،زیاد البکائی (م۱۸۳ھ)،ابن ہشام (م۲۱۸ھ) ،الواقدی (م۲۰۷ھ)،ابن سعد (م۲۳۰ھ)۔ [۵]

ان میں اہم ترین سیرت نگار اور مغازی نگار محمد بن اسحاق بن یسار تھے۔انھوں نے اپنی کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔حصہ اول کا انھوں نے ''المبتدا'' نام رکھا۔جس میں انھوں نے ابتدائے آفرینش سے رسول اللہ ﷺ کے اعلان نبوت تک مواد جمع کیا۔اسی حصہ میں رسول اللہ ﷺ سے قبل انبیاء اور اقوام کے احوال بھی درج ہیں۔حصہ دوم ''کتاب المغازی'' کہلاتا ہے

جورسول اللہ ﷺ کے اعلان نبوت سے شروع ہوکر آپ ﷺ کی وفات تک کے واقعات پر ختم ہوتا ہے۔اور حصہ سوم کا نام ''کتاب الخلفاء'' ہے۔اس سلسلہ میں جوٹکڑے دست بردزمانہ سے محفوظ رہ گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ابن اسحاق نے خلفائے راشدینؓ اور ابتدائی اموی حکمرانوں تک کے حالات تحریر کئے تھے۔ ۶

ابن اسحاق کی ''المبتدا والمبعث والمغازی'' پچھلے تیرہ سو برس سے ناپید تھی۔مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب مرحوم (پیرس) نے انتہائی عرق ریزی اور تحقیق وتلاش بسیار کے بعد اس کا ایک حصہ دریافت کیا اور اس کو رباط یونیورسٹی کے کلیۃ الآداب نے اپنے انتظام سے پہلی بار شائع کیا۔شائع شدہ اس حصہ میں درج موضوعات یوں ہیں: سلسلۂ نسب پاک، عبد المطلب کی نذر، عبد اللہ بن عبد المطلب کی شادی، قبیلہ حمیر کے بادشاہ، تبع اوسط کی حکایت، تبع کی قتل گاہ، اصحاب الفیل کا واقعہ، آنحضرت ﷺ کے جد امجد عبد المطلب کی وفات، بحیرا راہب کا قصہ، خدیجہؓ بنت خویلد کا واقعہ، رسول اللہ ﷺ کے متعلق علماء یہود کی بشارت، سلمان فارسیؓ کا اسلام لانا، آثار کعبہ، تعمیر کعبہ، رسول اللہ ﷺ کی بعثت، حضرت علیؓ کا اسلام لانا، حضرت ابوبکرؓ کا اسلام لانا، حضرت ابوذرؓ کا اسلام لانا، مہاجرین کا اسلام لانا، مسلمانوں پر ظلم وستم اور تشدد، حضرت حمزہؓ کا اسلام لانا، اصحاب رسول کی ہجرت حبشہ، اسمائے گرامی مہاجرین حبشہ، حضرت عمرؓ

کا اسلام لانا، مکہ مکرمہ میں قرآن کریم کی جہری تلاوت، تعذیب اہل ایمان، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مشرکین کی مخاصمت، سرزمین حبشہ کی طرف ہجرت، مہاجرین حبشہ کے اسمائے گرامی، قریش کی رسول اللہ ﷺ کو ایذا رسانی، اہل عرب کو رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ عام، ابو طالب کی وفات، وفات خدیجہؓ بنت خویلد، سیدہ ام کلثومؓ کا نکاح، زینبؓ بنت علیؓ کا نکاح، حضرت عثمانؓ کا نکاح، رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات، مذاق اڑانے والوں کا انجام، علامات نبوت، ام شریکؓ دوسیہ کا اسلام لانا، حضرت ابو ہریرہؓ کا اسلام لانا، عدی بن حاتمؓ کا اسلام لانا، مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک، غزوہ بدر، غزوہ سویق، غزوہ ذی امر، سریہ زید بن حارثہ، کعب بن اشرف کا قتل، غزوہ احد۔

ابن اسحاق پر عموماً یہ تنقید کی جاتی ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب ''السیرۃ'' میں من گھڑت اشعار نقل کئے ہیں، انساب کے بیان میں غلطیاں کی ہیں۔ اسناد درج کرنے میں لاپرواہی برتی ہے اور اہل کتاب پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا ہے،[۷] مگر اس تنقید کے باوجود یہ سہرا انہی کے سر ہے کہ انھوں نے پہلی بار سیرت، مغازی، انساب، فتوح، تذکرہ تاریخ خلفائے راشدینؓ اور اموی حکمرانوں کی تاریخ اور قدیم انبیاء کی تاریخ کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا حالانکہ اس سے قبل یہ علیحدہ علیحدہ موضوع تصور ہوتے تھے۔[۸] ابن ہشام نے بعد میں اشعار اور مشکوک روایات کو علاحدہ کر کے ''السیرۃ النبویہ'' کا ایک مختصر ایڈیشن

تیار کیا۔

ابن اسحاق کے بعد عمر الواقدی کا نام اہم ہے۔ وہ سیرت، مغازی اور عمومی تاریخ سے دلچسپی رکھتے تھے۔ خطیب بغدادی کے بیان کے مطابق انھوں نے کسی صحابی کی اولاد کو یہ پوچھے بغیر نہیں چھوڑا کہ ان کے والد نے کس کس جنگ میں شرکت کی اور شہادت کی صورت میں جائے شہادت کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اپنی تاریخ کو معتبر بنانے کے لئے وہ ان مقامات کا بچشم خود مشاہدہ کرنے جاتے جہاں پر مختلف لڑائیاں لڑی گئی تھیں۔۹

ابن الندیم نے واقدی کی اٹھائیس کتابوں کے نام لکھے ہیں جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ تاریخ میں مندرجہ ذیل کتابیں انھوں نے اپنی یادگار چھوڑیں۔

۱. کتاب التاریخ و المغازی ۲. کتاب اخبار مکه والمبعث

۳. کتاب الطبقات ۴. کتاب فتوح الشام

۵. کتاب فتوح العراق ۶. کتاب الجمل

۷. کتاب مقتل الحسن علیه السلام ۸. کتاب السیره

۹. کتاب ازواج النبی ۱۰. کتاب الرده و الدار

۱۱. کتاب الحرب الاوس ۱۲. کتاب الصفین والخزرج

۱۳. کتاب وفاۃ النبیؐ ۱۴. کتاب امرا الحبشۃ و الفیل

۱۵. کتاب المناکح ۱۶. کتاب السقیفۃ و بیعۃ ابی بکرؓ

۱۷. کتاب سیرۃ ابی بکر و وفاتہ ۱۸. کتاب مداعی قریش و الانصار فی القطائع و وضع العمر الدواوین و تصنیف القبائل و مراتبھا و انسابھا

۱۹. کتاب مولد الحسن و الحسین و مقتل الحسین ۲۰. کتاب ضرب الدنانیر و الدراھم

۲۱. کتاب تاریخ الفقھاء ۲۲. کتاب التاریخ الکبیر

۲۳. فتوح الافریقیہ ۲۴. کتاب فتوح مصر [10]

ان میں سے صرف کتاب المغازی (۳ جلد)، فتوح الشام (۲ جلد)، فتوح افریقیہ (۲ جلد) زیور طباعت سے آراستہ ہوئی ہیں۔

محدثین کو ان کے پایہ اعتبار پر شک ہے۔ بعض تو انھیں کذاب کہنے سے بھی نہیں چوکتے جبکہ دوسرے اہل علم حضرات تاریخ میں ان کی خدمات کے معترف ہیں۔[11]

محمد بن سعد (م۲۳۰ھ) نے واقدی کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کیا۔اس طرح انھین اسلامی تاریخ کے گہرے مطالعہ کا موقع ملا۔آٹھ جلدوں میں ان کی کتاب ''الطبقات'' ان کی محنت شاقہ اور علم وفضل کی شاہکار ہے۔اس میں ابن سعد نے رسول اکرم ﷺ، صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور اپنے وقت تک کے تبع تابعین کی حیات پر مواد اکٹھا کیا ہے۔سیرت رسول ﷺ پر پہلی دو جلدیں مکمل کرنے کے بعد، ایک باب ان لوگوں کے لئے مختص کیا ہے جو مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کے حین حیات فتویٰ دیتے تھے۔اس کے بعد صحابہ اور تابعین کا تذکرہ، ان کے مرتبہ کے مطابق کیا ہے۔آخری جلد ممتاز صحابیاتؓ کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔صحابہ کرامؓ کے سوانح، ہجرت حبشہ، جنگ بدر میں شرکت، فتح مکہ سے قبل قبولِ اسلام کی بنیاد پر ترتیب دئے گئے ہیں۔اس کے بعد ان مہاجرین کا تذکرہ ہے جو جنگ بدر میں شریک تھے۔اس کے بعد ان انصار کو لیا ہے جو جنگ بدر میں شریک تھے، اس کے بعد ان حضرات کا ذکر ہے جنھوں نے اسلام تو قبول کیا تھا مگر جنگ بدر میں شریک نہیں تھے یا جن لوگوں نے حبشہ ہجرت کی یا جو جنگ احد میں شرکت نہ کر سکے، اس کے بعد ان صحابہ کا ذکر ہے جنھوں نے فتح مکہ سے قبل اسلام قبول کیا۔باقی حضرات کا بھی تذکرہ اسی انداز سے ہے۔

کتاب الطبقات اپنے موضوع پر سب سے پہلی اور اہم ترین کتاب

تصور کی جاتی ہے۔اس موضوع پر واقدی کی طبقات کے علاوہ کوئی کتاب موجود نہیں تھی۔لہٰذا یہ کتاب ''ادب رجال'' کے قدیم ترین نمونوں میں سے ایک تصور کی جاتی ہے۔۱۲

احادیث میں صرف پیغمبر خدا ﷺ کی حیات طیبہ کو ہی ریکارڈ نہیں کیا گیا بلکہ آپ ﷺ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد جو واقعات رونما ہوئے،ان کو بھی ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔ذخیرہ احادیث نے اسلامی ریاست کی بنیادوں کو واضح کیا اور عرب سے باہر کے فتوحات کو بھی بیان کیا۔جہاں تک ابتدائی اسلامی سوسائٹی،خلافت راشدہ اور مملکت اسلامی میں توسیع کے واقعات کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں علماء کے دو گروہ ہیں۔ایک گروہ خالصتاً مدنی اور دوسرا عراقی ہے۔عراقی دبستان تاریخ نے قبل اسلام کے خاندانی شرف سے متعلق واقعات کو درج کرنے کے ساتھ ساتھ،ان سے متعلق اشعار کو بھی اپنی تاریخوں میں جگہ دی۔اس اسکول میں عراق کے ابو مخنف،عوانہ،سیف ابن عمر ہیں۔المدائنی نے ابتدائی اسلامی فتوحات کے بارے میں چھوٹے چھوٹے رسالوں میں مسلمانوں کی اندرون ملک سرگرمیوں اور ملّت کے اندر پیدا شدہ اختلافات کے بارے میں کتابیں لکھیں۔۱۳ان میں ابومخنف اہم ترین عالم تھے، جنھوں نے عرب،مصر،شام،ایران اور عراق پر کوئی چوبیس کتابچے تحریر کیے۔ان میں سے کوئی بھی کتاب اس وقت موجود نہیں البتہ ان کی تحریروں کے اکثر حصوں کو

ابومخنف ۔کے شاگرد ہشام بن محمد بن الکلبی الکوفی (م۲۰۶ھ) نے اپنی تالیفات میں سمیٹ لیا ہے۔ان تالیفات سے طبری نے خاصا مواد حاصل کیا ہے اور کسی حدتک بلاذری نے انساب الاشراف میں بھی استفادہ کیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالعزیز الدوری نے ابومخنف پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اسناد میں ضعیف ہیں واقعات کا عراقی رخ پیش کرتے ہیں اور شیعی نقطہ نظر سے متاثر نظر آتے ہیں۔۱۴ مگر ابومخنف کی جو تحریریں محفوظ ہیں ان کا مطالعہ ان الزامات کی تائید نہیں کرتا۔شیعی باغیوں اور خلافت کے دعوے دار افراد پر اُن کی نصف درجن کتابوں کے اقتباسات ان کی طرف داری کا ثبوت پیش نہیں کرتے اور غیر شیعی واقعات کے نقل کرنے سے ان الزامات کی بنیاد باقی ہی نہیں رہتی جو ان کے خلاف لگائے گئے ہیں۔۱۵

جہاں تک عوانہ بن حکم کوفی (م۱۴۷ھ) کا تعلق ہے وہ شاعری اور انساب سے مدد لیتے ہیں۔انھوں نے ''سیرت معاویہ و بنی امیہ'' لکھی۔اپنی ''کتاب التاریخ'' میں (جس کے اقتباسات بعد کی تاریخوں میں محفوظ ہیں) انھوں نے خلافت راشدہ، ردّہ اور اسلامی فتوحات پر مواد جمع کیا، انھوں نے حضرت علیؓ اور ان کے مخالفین کی جنگوں، حضرت حسنؓ کی تخت خلافت سے دست برداری اور عبدالملک بن مروان کے زمانے تک کے شام و عراق کے مسائل و حالات کے بارے میں معتبر معلومات بہم پہنچائی ہیں۔۱۶

سیف بن عمر (م ۱۸۰ھ) نے ردّہ اور فتوح پر دو کتابیں ''کتاب الفتوح الکبیر والردہ'' اور ''کتاب الجمل وسیر عایشہؓ وعلیؓ'' ۱۷ تحریر کیں۔ طبری نے جنگ صفین پر لکھتے وقت تین سو بار سیف کا حوالہ دیا ہے۔ ۱۸

علی بن محمد المدائینی (م ۲۲۵ھ) بصرہ میں پیدا ہوئے اور بغداد میں زندگی گزاری۔ طریقہ اسناد کا اثر ان کی تحریروں میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ انھوں نے دوسو پینتالیس (۲۴۵) کتابیں لکھ کر علم التاریخ کی بڑی خدمت انجام دی۔ ان میں ''کتاب اخبار الخلفاء الکبیر''، ''کتاب الدولہ العباسیہ''، ''کتاب فتوح خراسان''، ''تاریخ بصرہ'' بھی شامل ہیں۔ محققین المدائنی کے مداح ہیں کہ انھوں نے مواد لیتے وقت متوازن انتخاب کے اصول کو پیش نظر رکھا ہے۔ ۱۹

قبل اسلام کے زمانے میں عرب عموماً شاعری کے ذریعہ اپنے انساب کو محفوظ کر لیتے تھے۔ شعراء اپنی منظومات سے پہلے کچھ نثر میں بھی لکھ لیا کرتے تھے تاکہ قوم کے غامض اور غیر معروف واقعات کی وضاحت کر سکیں۔ اس چیز نے مورخوں کے لیے اہم مواد فراہم کیا۔ محمد بن السائب الکلبی (م ۱۴۶ھ) اس گروپ کے نمائندہ ہیں۔ وہ تاریخ وانساب کے بڑے فاضل تھے۔ خاندانوں کے انساب جمع کرنے کے لئے گھر گھر جاتے۔ ان کی کسی کتاب کا تذکرہ تو نہیں ملتا البتہ اُن کے فرزند ہشام بن محمد نے ڈیڑھ سو کے قریب کتابیں لکھیں جن میں

سے بعض یہ ہیں۔ کتاب الجمھرہ، کتاب المنزل، کتاب الکلب، کتاب الفرید، نسب فحول الخیل فی الجاھلیتہ و الاسلام، کتاب الملوک، کتاب الاصنام، کتاب مثالب العرب۔[۲۰]

مصعب بن عبد اللہ (م۲۳۳ھ) بھی انساب سے دلچسپی رکھتے تھے۔انھوں نے اس موضوع پر ''النسب الکبیر'' اور ''کتاب الجمھرہ فی نسب قریش'' لکھیں۔[۲۱]

احمد بن یحییٰ البلاذری (م۲۷۹ھ) انساب کے اہم اور معتبر عالموں میں شمار ہوتے ہیں۔ان کی ''انساب الاشراف'' ادب انساب کی شاہکار تالیف تصور کی جاتی ہے جو پانچ جلدوں میں ہے۔اس کتاب میں اسلامی تاریخ پر گراں قدر مواد ملتا ہے۔تاریخ میں انھوں نے ''عھد اردشیر''، ''فتوح البلدان'' اور ''کتاب البلدان الکبیر''[۲۲] جیسی اعلیٰ پائے کی کتابیں لکھیں۔ فتوح البلدان کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں ایسی معلومات فراہم ہوتی ہیں جو دوسری کتب تاریخ میں نہیں ملتیں۔خاص طور پر عراق کے قدیم تباہ شدہ شہروں کے بارے میں نادر معلومات

دینے میں وہ منفرد ہیں۔کہا جاتا ہے کہ اصل میں فتوح البلدان کے موضوع پر چالیس جلدوں میں مواد جمع کیا تھا۔موجودہ کتاب اس کا صرف ایک اختصار ہے۔[۲۳] فتوح البلدان کا آغاز غزوات نبوی ﷺ سے ہوتا ہے۔اس کے بعد

اس میں واقعات ردّہ، شام، الجزیرہ، آرمینیا، مصر، مغرب، عراق اور ایران کی فتوحات کے بارے میں تفصیلات درج ہیں اس کے علاوہ ان ممالک کے سماجی اور ثقافتی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے جس سے اس تصنیف کی اہمیت دو چند ہوگئی ہے۔

انساب الاشراف، انساب نگاری کے انداز میں تالیف کی گئی ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ، ان کے خاندان اور رشتہ داروں کا تذکرہ ہے۔ علویوں کے بعد عباسیوں کے انساب درج کیے ہیں۔ عبد شمس، بنی ہاشم، قریش، مضر، قیس، ثقیف اور باقی خاندانوں کے انساب کو بھی جمع کیا ہے۔ کتاب حجاج بن یوسف کے تذکرہ پر ختم ہوتی ہے۔ انساب الاشراف میں خلفاء اور ان سے متعلق واقعات کو باب وار بیان کیا ہے اور ہر باب کا ایک عنوان ہے۔ اس میں بلاذری نے ابومخنف اور مدائنی کے رسالوں سے خاصا اخذ واستفادہ کیا ہے۔ گو یہ کتاب انساب کی ہے مگر اپنے مواد کے اعتبار سے یہ طبقات ابن سعد سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔[۲۴]

اسلام دور دراز مقامات تک پھیلا تو انساب کے طرز پر یا علاقائی بنیادوں پر تاریخ نگاری کا کام خاصا مشکل ہوگیا۔ اس صورت حال نے مورخوں کو مجبور کیا کہ وہ عالمی سطح کی تواریخ لکھیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسی ہی تاریخیں قلم بند کرنا شروع کیں جن مین عربوں کی تاریخ کے علاوہ ایرانیوں، یونانیوں اور

ہندوستانیوں کی تاریخ کے بارے میں بھی معلومات ہوتی تھیں۔ مورخوں نے وہ چیزیں بھی ریکارڈ کیں جنھیں انسانی تہذیب وثقافت کے لحاظ سے اہم تصور کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بلاذری کا نام سرفہرست ہے۔ بلاذری نے پھیلے ہوئے واقعات کو ممکنہ حد تک جانچ پڑتال کے بعد تحریر میں لانے کا اہتمام کیا ہے۔ ان کی فتوح البلدان نہ صرف عربوں کی فتوحات کا ایک معتبر ریکارڈ ہے بلکہ اس میں مفتوحہ ممالک کی مالیات، سماجیات اور انتظامیہ سے متعلق بھی اہم حالات و معلومات محفوظ ہیں۔ ۲۵

عالمی تاریخ نگاری کے دوسرے اہم مورخ احمد بن یعقوب الیعقوبی ہیں۔ وہ مورخ ہونے کے علاوہ جغرافیہ دان بھی تھے۔ انھوں نے شرق وغرب کی سیاحت کی، عرب ممالک اور ہندوستان کا دورہ کیا، شام، مغرب اور اندلس بھی گئے۔ وہ جہاں جاتے وہاں کے باشندوں سے ان کے ماضی، عادات واطوار اور انداز حیات کے بارے میں استفسار کرتے۔ ان کی ''التاریخ الکبیر'' چھپ چکی ہے، جس میں انھوں نے آدمؑ سے لے کر ۲۵۹ھ تک کے واقعات کا احاطہ کیا ہے۔ اسلامی تاریخ کے علاوہ اس میں اسرائیلیوں، شامیوں، ہندوؤں، یونانیوں، رومیوں، ایرانیوں، حمیریوں اور غسانیوں وغیرہ کی تاریخ بھی آگئی ہے۔ یعقوبی نے اپنی تاریخ کو ترتیب واقعات (Chronological) کے انداز پر لکھا ہے۔ ان کی تاریخ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی قدر شیعی نقطہ نظر کے

حامل ہیں۔افسوس ہے کہ انھوں نے ایام عرب پر کچھ نہیں لکھا ہے۔اگر وہ اس موضوع پر بھی کچھ لکھتے تو کتاب کے وزن میں اضافہ ہوتا۔اساطیر وخرافات سے جو اجتناب یعقوبی کے یہاں پایا جاتا ہے وہ ان کے سائنٹفک ذہن کے میلان کی علامت ہے۔[۲۶]

عبداللہ بن مسلم ابن قتیبہ (م۲۷۶ھ) نے ''کتاب المعارف'' اور ''عیون الاخبار'' نامی کتابیں لکھ کر خاصا تاریخی مواد فراہم کر دیا ہے۔ان کی کتاب المعارف تاریخی معلومات کا ایک قیمتی ذخیرہ ہے جس میں فہارس، سیرت نبویؐ کے واقعات، انساب، فرقوں وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ اس کتاب کی افادیت مسلّم ہے مگر اس کو صحیح معنوں مین مشکل ہی سے تاریخ کا نام دیا جا سکتا ہے۔[۲۷]

عالمی تاریخ نگاروں میں ابو حنیفہ احمد بن داود الدینوری (م۲۸۲ھ) کا نام بھی اہم ہے۔انھوں نے فلکیات، ادب اور فلسفہ پر لکھنے کے علاوہ تاریخ پر بھی ''اخبار الطّوال'' جیسی قابل قدر کتاب تصنیف کی۔اس تاریخ میں انھوں نے ایران کی تاریخ پر خاصا مواد جمع کیا ہے جو دوسرے موضوعات کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ ہے۔حضرت آدمؑ سے لے کر معتصم باللہ کے زمانے تک کے حالات کا احاطہ کیا ہے۔دینوری نے اپنی تاریخ میں سلسلہ اسناد کو ترک کر کے واقعات کو ترتیب سنین کے لحاظ سے محفوظ کیا ہے۔

اس سلسلہ کے اہم ترین مورخ ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (م۳۱۰ھ) ہیں۔ جنھوں نے دس جلدوں میں ''تاریخ الرسل و الملوک'' لکھ کر علم تاریخ پر بڑا احسان کیا۔ یہ تاریخ تخلیق کائنات سے شروع ہوتی ہے۔ انھوں نے پیغمبروں، قدیم بادشاہوں، ساسانیوں، ایرانیوں، رومیوں اور عربوں پر تفصیلی معلومات درج کی ہیں۔ ایران کی تاریخ لکھنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے شجرہ نسب سے لے کر ۳۰۲ھ تک کے حالات و واقعات کو بہت ہی تفصیل سے ریکارڈ کیا ہے۔

طبری کا انحصار اپنے متقدمین پر رہا ہے۔ انھوں نے نہ صرف ان واقعات کو اپنی تاریخ میں جگہ دی۔ ہے جو ان کے اپنے ذوق کے مطابق تھے بلکہ بسا اوقات کسی واقعہ کے متعلق تمام پہلوؤں سے معلومات جمع کر دیتے ہیں اور اپنی رائے نہیں دیتے۔ وہ چونکہ محدّث تھے اس لئے انھون نے اپنی تاریخ میں اسناد کا التزام کیا ہے۔ دور جاہلیت کے خاتمہ تک انھوں نے واقعات کو ترتیب زمانی کے لحاظ سے رقم کیا ہے البتہ اسلامی دور سے لے کر ۲۰۳ھ تک کے واقعات کو ترتیب سنین (Annalistically) کے طور پر لکھا ہے۔ تاریخ میں ترتیب سنین کا التزام مسلمان مورخوں کی دین ہے۔ یورپ اس طرز سے ۱۵۹۷ء تک بے خبر تھا۔[۲۸]

طبری کی تاریخ بعد کے تمام مورخوں کے لئے بنیادی ماخذ رہی ہے اور

ہمیشہ رہے گی۔ مسعودی، مسکویہ، ابن الاثیر، ابن خلدون جیسے مورخین نے اس سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔

ابو الحسن علی بن حسین المسعودی (م ۳۴۶ھ) بہت بڑے مورخ اور جغرافیہ دان تھے۔ انھوں نے تاریخ کے موضوعات پر چونتیس کتابیں لکھیں جن میں ''مروج الذہب و معادن الجوہر'' ''اخبار الزماں'' اور ''التنبیہ والاشراف'' وغیرہ چھپ چکی ہیں۔ ان میں ''مروج الذہب'' عالمی شہرت کی حامل ہے۔ اسی طرح ''التنبیہ والاشراف'' کا تعلق بھی تاریخ عالم سے ہے جو ۳۴۵ھ کے واقعات پر ختم ہوتی ہے۔

مسعودی کا انداز اپنے معاصرین سے مختلف ہے۔ انھوں نے اپنی تاریخ میں سیاسی واقعات کے علاوہ سماجی، ثقافتی اور اقتصادی معلومات کو بھی پوری طرح جگہ دی ہے اس لحاظ سے مسعودی کی تاریخ تالیفات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔[۲۹]

شہروں وقصبوں کی تاریخ لکھنا بھی مورخین کا دلچسپ مشغلہ رہا ہے۔ محمد بن عبداللہ الازرقی (م ۲۲۳ھ) نے ''کتاب اخبار ایام مکہ''[۳۰] لکھ کر مکہ کی تاریخ محفوظ کی۔ اس کے علاوہ اور لوگوں نے بھی مکہ کی تاریخ تحریر کی۔ مدینہ کی تاریخ پر یحییٰ بن عابدی نے ''اخبار مدینہ'' نام کی ایک کتاب لکھی۔ اسی طرح باقی شہروں کی بھی تاریخ محفوظ کی گئی۔

حوالے

۱) Lise Lichtenstandler:

Article"Arabic And Islamic Historiography" in

Muslim World, New York,1945.p.126

۲) عبدالعزیز الدوری: بحث فی نشاة علم التاریخ عند العرب، بیروت

سنہ ۱۹۶۰ء ص، ص ۱۳۔۱۶

۳) Muslim World,p.126

۴) Francesco Gabrieli: Article"Arabic

Historiography",in Quartely Islamic

Studies,Pakistan.Vol.18,1979,p.82

۵) احمد امین: ضحیٰ الاسلام، قاہرہ، سنہ ۱۹۵۴ء، ص ۳۲۰

۶) عبدالعزیز الدوری، ص ص ۳۰

۷) الذہبی: میزان الاعتدال فی نقد الرجال، مصر سنہ ۱۹۰۷ء، ص ۲۱۔۲۲

تذکرة الحفاظ، حیدرآباد سنہ ۱۹۵۵ء، ص ۱۷۲۔۱۷۳

ابن العماد الحنبلی: شذرات الذهب، ج ۱، ص ۲۳۰

۸) محمود الحسن: عربوں میں تاریخ نگاری کا آغاز وارتقا، نئی دلی، سنہ ۱۹۷۵ء، ص ۸۱

۹) ابن الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، مصر سنہ ۱۹۳۱ء، ج ۳، ص ۶

۱۰)ابن الندیم: الفهرست، مصر ۱۹۲۹ء، ص ص ۱۴۴۔۱۴۵

۱۱)ابن الخلکان: وفیات الاعیان، قاہرہ ۱۹۴۸ء، ج ۳، ص ۴۷۱

الفهرست، ص ۱۴۴۔

ابن حجر العسقلانی: تهذیب التهذیب حیدرآباد ۱۹۱۴ء، ج ۹، ص ص ۳۶۳۔۳۶۴

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (انگریزی)، لائڈن (ہالینڈ) ۱۷۔۱۹۶۷ء، ج ۴، ص ۱۱۰۵

۱۲)ابن سعد: کتاب الکبریٰ، بیروت ۱۹۵۷ء، مقدمہ احسان عباس

۱۳)Islamic Studies,P.84

۱۴)عبدالعزیز الدوری، ص ص ۳۵۔۳۶

۱۵) Fariq:History of Arabic Literature.-Umayyad Period,Delhi 1978,p.103

۱۶)عبد العزیز الدوری، ص ۳۶، ابن الندیم، ص ۱۷۰

۱۷)ابن الندیم، ص ۱۴۳

۱۸)عبد العزیز الدوری، ص ۱۳۱

۱۹)عبد العزیز الدوری، ص ص ۱۳۴۔۱۳۶

۲۰)جُرجی زیدان: تاریخ آداب اللغته العربیه، قاہرہ ۱۹۳۱ء، ج ۲، ص ۱۵۲

احمد امین، ج ۴، ص ص ۲۴۸۔۲۴۹

۲۱)بروکلمان: تاریخ الادب العربی، مصر ۱۹۶۲ء، ج ۳، ص ۳۳

۲۲)خیر الدین الزرکلی: الاعلام، قاہرہ ۱۹۵۴ء، ج ۱، ص ۲۵۲

۲۳)انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (انگریزی)، لائڈن، ج۱،ص۱۷۹
۲۴)انسائیکلوپیڈیا آف اسلسم (انگریزی)،لندن،ص۱۷۹
۲۵) Islamic Studies,P.85
۲۶)محمود الحسن: عربوں میں تاریخ نگاری کا آغاز وارتقا،ص۱۷۱
۲۷) Margoliouth:Arabic Historians,Reprint Delhi 1977,p.120
۲۸)الحوفی: الطبری، مصر ۱۹۶۳ء، ص ص ۱۹۱۔۱۹۴
۲۹) Encyclopedia Britanica,U.S.A,1977,Vol.2,P,610
۳۰)جُرجی زیدان، ج۲،ص۲۰۰۔حاجی خلیفه: کشف الظنون ، قسطنطنیه، ۱۹۴۱ء، ج۱،ص۳۰۶

IQBAL INSTITUTE

University of Kashmir, Hazratbal Srinagar